

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222059

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. A 71.067 Acc. No. 1718

1919

1919

1919

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. H 52 C

Accession No. 87-12

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

--	--	--	--

طغیان

پیش کردہ

اردو نشر گاہ دہلی

طغیان

قاضی نذرا الاسلام

مترجم

محمد یونس احمر

حیدر حق بنی ناسر محفوظ!

صنائتوں کتاب گھر

اردو بازار، دہلی

قیمت ڈھائی روپے

ترتیب

۷	ماٹھی ایسا گیت نہ گا ..
۲۳	رم بھم ..
۴۳	سلمانوں کے پیچھے ..
۶۹	سب بیتیاں ..
۹۵	شعے اور پھول ..
۱۲۷	خ ..
۱۴۱	مہنگار ..
۱۷۵	خلا ..
۱۹۷	نذر الاسلام کے افسانے ..

مانھی پیا کیت گاہ!

ابتداء

”تم میری بنیم فشاں آنکھوں سے دور تھیں یا راہِ حقیقت سے

جانِ آرزو! میری اس دوری کو اپنی شہِ رگ سے بھی قریب کر لو!

ابھی تم رشتہٴ نو میں منسلک ہوئی ہو،

مہتابِ تبسمِ نیا ہے، آنسو نئے ہیں،

تکبیلِ آرزوئی ہے، اور گیت کی لہروں کی طرح

یہ دعوتِ عیشِ مقدس ہے

مگر آہ! میرے راگ کے سُرنِ جامِ کہاں کھو گئے!

میری رانی! میری تِناؤں کی ناکامیاں آج مہلے خالق کا عطیہ ہیں،

آج میرے خیالات کی گہری آغوش میں مہتابیِ اساسِ قمر اٹھائی جائیگی!

صبح کی خاموشی میں میں نے سنی۔۔۔

گائے کے گھنگرد کی دلفریب آواز،

افقِ بعید میں شکست کی صدائے بازگشت!

رانی! اوداع! اختتامِ وقت کے ساتھ ساتھ کھیل بھی ختم ہو گیا

ابھی تم نئی مخلوق ہو۔ وہ دیکھو تمہارا قصرِ عالیشان بھی نیا ہے!“

مانجھی ایسا گیت نہ گا

شام کی بھیانک تاریکی میں مجھے چلتے چلتے احساس ہوا کہ جس بد نصیبان کی کٹی میں چراغِ شب روشن کرنے کے لئے کوئی نوجوان دوشیزہ موجود نہ ہو۔ اس کی طرح دنیا میں اور کون بد بخت ہو سکتا ہے۔

سینہ آسمان میں ایک رخشندہ ستارے نے اشکبار نگاہوں سے مجھے اس بات کا احساس دلایا اور میدان کی خاموشی ہوا سنسناتی ہوئی یہ بات کہہ گئی۔
 "شام کا یہی ایک تارہ مہتار اُدکھہتا ہے"

اور شام کی اس اُداسی میں گھر کر اگر کوئی مصیبت زدہ ایک گاؤں کو دوسرے گاؤں میں رختِ سفر باندھے۔ اور اسکی آنکھوں کے سامنے ستارہ شام پارہ جگر

کی مانند تڑپ اٹھے تو وہی جان سکتا ہے کہ اس عالم جانکنی میں اس کے ذہن و فکر کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔

میں نے رگستان کی لامحدود دستوں میں اپنے سفر کا آغاز کیا ہے۔ خاموشی اور سکوت کا یہ عالم ہے کہ دل کی دھڑکنیں بہ آسانی سُنانی دے رہی ہیں۔ لیکن نہ جانے کس درخت کی شاخ میں طیور نغمہ سرا ہیں۔ اور اسی کا حسین راگ رونی کے گالے کی طرح اتر کر میرے خاموش دل کو گدگداتا ہے۔ جوں جوں رات کی جوانیاں باندازِ مستانہ نمودار ہوتی ہیں، ستاروں کی نظر فریب لڑیاں قطار اندر قطار جو سما میں ملکوتی نغمے بلند کر رہی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح میرے دیران دل کے اندر بھی مٹے مٹے فسانے اور فراموش شدہ کہانیاں طلوع ہو رہی ہیں۔

میرا تمام نظامِ عصبی صرف ایک دُکھ سے مائل گریہ و زاری ہوتا ہے۔ اور وہ ہے دل کی دہی ہوئی خلش! ایسی خلش جس کا کوئی شمار نہیں۔ بتاؤ خدا کوئی بتاؤ میں اپنے اس دُکھ کی تلخ اور شیریں کہانیوں کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ کالاناگ جب میرا چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے تو اس میرے کی چمک باہر نہیں جا سکتی۔ ٹھیک یہی حال میرا ہے۔ میں بھی اپنے دل کے میرے اور دُکھ کے ٹکڑے کو بھٹلا نہیں سکا۔

موتی کو میں بچپن سے جانتا ہوں۔ بچپن سے! جب بھوڑا سے مکی سمجھ کر قبل کا منتظر تھا۔ جب دریا نے شباب کی موجیں ہنوز ساکن تھیں۔ جب چاند کی ضیا پوش شعاعیں ہنوز سیاہ بادلوں کے لطیف ٹکڑوں میں جھلیل کر رہی تھیں۔ آہ اوہ

بھی کیا دن تھے !

اس کی ٹیٹا میری کٹیا کے بالکل متصل تھی۔ ہم ایک دوسرے کو انوکھے طریقے سے پیاد کرتے تھے۔ مجھے اسی وقت اس کی موجودگی کی ضرورت پڑنی جب میرے دونوں ہاتھ کسی کوزہ کو دب کرنے کیلئے بیقرار رہتے۔ اور میری ماں بھی بالکل زالی تھی۔ بلاوجہ مارنے میں بہت لطف ملتا تھا۔ اور جب واقعی کوئی وجہ ہوتی تو نہ معلوم میرے ہاتھ کیوں رُک جاتے۔ اُسے بھی نہ معلوم کیوں میری حرکت سے بہت کچھ انسیت ہو چکی تھی۔ کیونکہ اگر دو ایک دن میں بھول جاتا تو وہ آکر ہنستے ہنستے بولتی : کیوں روٹھ گئے تم۔ دو دن مار جو نہیں کھائی ؟

اور میں پشیمانی پر بل ڈالتے ہوئے کہتا : نہیں ہوتی۔ اور اب مجھے مارتے ہوئے شرم ہی آتی ہے۔ یہ کہہ کر میرے سامنے جو عمدہ چیز رکھی نظر آتی میں اُسے دیکر دل کی چنگاریاں سرور کرتا۔ تاکہ وہ میری لزش کو فراموش کر دے۔

کتابوں سے نئی نئی تصویریں کاٹ کر دنیا میرا معمول بن چکا تھا۔ کیونکہ میری نگاہ میں ابھی سب سے بہترین تحفہ تھا۔ اور مجھے اسکول میں کتابیں رومی کرنے کی یہ سزا ملتی کہ میں گھنٹوں میز کے اوپر کھڑا رہتا۔

ایک دن میں نے ازراہ شرارت اس امید میں رونا شروع کیا کہ وہ میرے آستوخٹک کرنے ضرور آئیگی۔ لیکن جب دیکھا کہ اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ تو میں نے اس کے سارے جسم کو اپنی پوری قوت سے جھجھوڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ رو

جی اور میں قہقہہ لگانے لگا۔ جب اس کے آنسو تھے تو مجھے خشم آلود لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی یہ تو ہے ہی دل کی ہمدردی ساری انگلیاں چھی! شتم نہیں آتی بھئی!۔“

اور میں نے اس کی پشت کو ہلاتے ہوئے کہا: بھگی! ذرا سی چوٹ پر بلبلا اٹھی!۔“

ایک دن کا اور ذکر ہے کہ میں نے اس کے بازیچہ خانہ کی سب چیزوں کو توڑ پھوٹ دیا۔ اور اس نے واقعی میری انگلیوں کو چوب خشک سے مجروح کر دیا۔ اس کی اس حرکت سے عزیز ارادی طور پر میرے ہونٹ مسکرانے لگے۔ میری اس مسکراہٹ کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ پھر میرے پاس آ کر بالوں سے کھیلتے ہوئے کہنے لگی: ”معاف کرنا مجھے سخت ندامت ہے۔ چوٹ تو نہیں آئی؟“۔ پھر کچھ عرصے کے بعد میرے اُبھے ہوئے بالوں کو سلجھاتے ہوئے بولی: ”بھئی! لڑکی بننے کا شوق چڑا رہا ہے شاید ہائے اللہ! اتنے لمبے لمبے بال!“۔

اس سنان راہ کو بھٹوڑا طے کرنے کے بعد میرا دل پوچھ اٹھتا: ”ہاں تو اس کے بعد کیا ہوا؟“

میرے دل کے قصہ گو نے اس خاموش شام کی اُدا سی میں اپنا افسانہ بھلا دینا چاہا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں میری ساکت زبان کو جنبش ہوئی: ”نہیں ہنیں موتی میں نے تم سے اس دن جھوٹ کہا تھا۔ واقعی میں تمہیں چاہتا ہوں“۔ اس کے

بعد بھیا نک خاموشی میں موسیقی کا راگ جاگ اٹھا۔ اور اس کے سحر آلود سرد امن
مشرق سے طحڑا کر ہنگامہ برپا کرنے لگے۔ اور میری دائمی تشنہ روح بھی اس
نشاط انجیزاگ کے پھیلنے میں مدغم ہو گئی۔

اسی طرح ہمارے دن اور رات گونا گوں عشقوں میں گزرنے لگے۔ یہاں
تک کہ موتی دیکھتے دیکھتے ایک دن عالم شباب کو پہنچ گئی۔ اب اس کی عمر
چودہ سال کی ہو چکی تھی۔ اور نہ جانے کس طرح اسی اظہر جوانی میں اسے ٹھیس لگی۔
ٹھیس کی اس شدید ضرب سے وہ تمللا اٹھی۔ اور میرے جوش و دھواں
بھی کانپ اٹھے۔ اور فوراً نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ اس لپکی سے میری
زندگی کا بہاؤ ساکن ہو جائیگا۔

جب دریا کی غضب ناک روانیاں اپنا ترنگ کھودتی ہیں۔ اس وقت آس
کے کلیجہ میں جھپٹن سی محسوس ہوتی ہے۔ اور جب آزادی کے کھلے ہوئے دھڑکے میں
زبردستی اینٹھن آجاتی ہے تو فوراً اس کے جوش کی مسرت انگیز رفتار سے کش مکش اور
جنگ کی بانسری پھوٹ پڑتی ہے۔ بعینہ اسی طرح جب دوراہی کو باندھ دینے کا
ارادہ کیا جاتا ہے تو ہماری آزادیاں باغی بن کر تحریب کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں !
بتاؤ وہ کون ہے جو دریا کے پھیلنے کو روک دے۔ کون ہے جو دل کی جولانیاں
سرد کر سکے ؟

میں اسی بیچ در بیچ تخیل کی دنیا میں سانس لے رہا تھا کہ یکایک ہوا کی تیز

روانی یہ بول کر بھاگ گئی۔ جس کو تو نے دل میں جگہ دی ہے اُسے بہر حال ٹھونڈا ہی ہوگا۔

اس باغیانہ اعلان سے فریب خوردہ جن کا ماتم ہونے لگا۔ اور ٹولی ٹھوٹی تننا اس کی آغوش میں شعاع آزادی پھیلا کر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ اپنی جان تننا کو ڈھونڈنے نکلی اور دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ ”شریک حیات کو نہ پا کر اپنی راہ بھول جاؤنگی، اس آزادی اور بندھن کے احساس نے اس کی چھاتی میں آتشیں لاوے کی دھاریں بہا دیں لیکن سراج نے حج کر کہا: اپنی اس آزادی کو بالائے طاق رکھ دو۔ دیکھو میں یہ دیوار حائل کر دیتا ہوں“ ان میں سے بہت سی دیواروں کو تو لنگہ کی بیتاب موجیں بہا لے گئیں۔ مگر پتھر کی اس دیوار کو نہ بہا سکیں۔

سراج کی اس گندی حرکت سے میرے دل کا سکون درہم برہم ہو گیا۔ اوڑیں سوچنے لگا کیوں نہ اس کی محبت کی آگ پر شبنم کی بوندیں چھڑک دوں۔ کیوں نہ میں اس کی یاد کو دل سے فراموش کر دوں لیکن آہ میں اسے جتنا بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی زیادہ وہ میرے سیکل اور مجروح دل کو اپنی آتش محبت سے بھڑکاتی رہتی ہے۔ آخر کیوں؟ کیا یہ میرے جذبات، مضطرب شہتی کی مانند ہمیشہ لرزاں رہیں گے۔ کیا میں ان بلا خیز ہنگامہ آرائیوں میں گھر کر تازہ نیست آہ و فغاں کی دلدوز انگیناں سنتا رہوں گا!

سمندر کی موجیں دریا کی طرف بڑھیں۔ اور دریائے اے چھوٹے کیلئے

بے پناہ اشتعل موجوں کے ساتھ بڑھنا چاہا۔ لیکن صدحیف! انجام دونوں کا ایک ہوا
یعنی پریشان ہو کر دونوں نے اپنی اپنی موجیں سیٹ لیں۔ کسے معلوم ان دونوں میں
کب اتصال ہوگا۔ کب ہم آغوشی ہوگی۔

اس کے بعد سے ہم دونوں کی ملاقات بند ہو گئی۔ اگر کبھی اتفاقات گفتگو کا موقع
ملتا بھی تو سماج کی سفاک نگاہوں سے بچکر۔ یا نہیں تو دیکھے سے جھانک کر لیکن
آہ! اس مختصر سی گھڑی کی دید میرے حشر بن دل کے نفتہ انگارے کو اور ہوا دے
جاتی ہے۔

پانچ سال بعد — !

ایک دن میں نے سنا کہ اس کی شادی گاؤں کے بڑے زمیندار کے بیٹے سے
پاس لڑکے کے ساتھ رہنے والی ہے۔ اور شادی کے ساتھ ہی مجھ مسافر کی محبت بھی
ختم ہو جائیگی۔ اس احساس سے میرے کلیجہ میں ایک داغ سا پڑ گیا۔ اور ایسا معلوم
ہوا کہ شیشہ دل کو کوئی پاش پاش کر رہا ہے۔ لیکن برب مجھے یہ محسوس ہوا کہ ابھی تا ایک
زندگی سونے اور چاندی کی حسین آغوش میں کٹے گی۔ تو میں نے اپنی تمام تر خلش کو دھو
ڈالنا چاہا۔ لیکن پھر یہ دکھ کس لئے۔ آہ! وہ عیش و عشرت کی شاندار عمارت میں دُہن
بن کر جا بیگی۔ اس کی ساری خواہشیں بات کی بات میں پوری ہونگی۔ سب کچھ ہوگا
لیکن میرا یہ بیکل دل مانتا کیوں نہیں۔ آہ میری قسمت !

ان باتوں کو سوچ سوچ کر میری چھاتی درد انگیز راگنی میں حلول ہو جاتی ہے
میرے ظاہری و باطنی آلام و مصائب کے نقوش ہویدا ہو جاتے ہیں۔ میں نے
فطرت سے مخاطب ہو کر یہ الفاظ کہے —

”اپنی خوشی تقسیم کر کے دوسروں سے انتقام لوں گا۔ اور غرور و نخوت
میرے سر کو اور بلند کر دیں گے“

”میری رانی سکھی ہوگی۔“ یہی خیال میرے دل میں بار بار مونگ دلتا رہتا
ہے۔ ایک دن یکایک میری چھاتی کے تمام درد و دکھ غلش اوڑھیں سکون و اطمینان
سے بدل گئی۔ اور جیسے میری ویران خزاں رسیدہ دنیا میں شانتی کی راگیناں جھنکا
پیدا کرنے لگیں، دیکھ تو ذرا آج مجھے اشک ریزی کرنے کے بعد ایک دنیا ملی ہے۔
جہاں گردش آفاق کے پتھیرے اور آلام و مصائب کی بے پناہ چیرہ دستیایں معدوم
ہیں۔

کیسی آرزو کی بانسری کا سحر انگیز راگ ہے جس نے میرے ازلی بیدار دل
کو تھپک کر سزا دیا ہے۔ ہائے تنے دنوں تک بانسری کی یہ مدھرتان کہاں روپوش
تھی !

اس میں نصف شب کے عین سناٹے میں اس کی یاد سے مجبور ہو کر یہ راگ
چھیڑ رہا تھا۔

تو دنیا میں چھیڑا تھا راگ بڑی کوششوں سے محبت کو جیتا

دورانِ نغمہ میں میں نے دیکھا کہ طویل وعین میدان میں شام کی پرچائیاں ایک دوسرے میں سما جانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اور وہ در حدِ نظر سے دور مٹی کے مکانوں میں چرند کے دھوئیں کے نشانات ہوا میں تیر رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر میرا شک تہ دلِ بارغم سے پڑمردہ ہو گیا۔ کاش میری کنیا میں بھی کوئی چراغِ روشن کرنے والا ہاتھ ہوتا۔ کیا مجھ بد بخت کی اندھیری کنیا اسی طرح تاریکی میں سرپٹتی رہے گی۔ پھر مجھے یہ احساس ہوا کہ چراغ کے سامنے جو گھنٹا لٹنے بیٹھی ہے کاش وہ اپنی دوا شک آلود بیکل آنکھوں کو لیکر میرے قریب آجائے۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یکایک جنوبی ہوا سے درخت کا پتہ کھڑکا اور ایک ٹریل آواز کانوں کو حیر کر چلی گئی۔

”راہی! گھبرا مت۔ اب انتظار کا پھل ملنے والا ہے“

اور میرے دل کی تاریں ایک ساتھ جھٹکار کر بول اٹھیں۔ ان باتوں کو پیچھے سوچ لینا۔ بتاؤ پھر کیا ہوا؟“

اس وقت میدان کے چاروں طرف قبرستان کی سی ادا سی اور خاموشی پھیل چکی تھی۔ آلام و مصائب کے ساتھ مقدس محبت مدغم ہو کر میری آنکھوں کی خستہ پلکوں کو جھنجھوڑ کر چلی گئی۔

بھگبار آنکھوں کے پردے میں باقی ماندہ تقویر کے نقوش پھرا بھرنا شروع ہوئے۔

موتی کی شادی کے دن سے کچھ قبل اس کے ساتھ میری پہلی اور آخری ملاقات

ہوئی تھی۔ اور اس نے کہا تھا۔ ”میری شادی کی خبر تو تم نے سنی ہوگی۔ اب کیا ہوگا بولو؟“

میں نے کہا۔ ”تم سبھی ہوگی“

یہ سن کر جیسے اس کی چھاتی تڑپ اٹھی، دل میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ اور صفحہ آسمان میں تاروں کی جھللاتی لڑیاں ایک ساتھ مسکرائیں۔ پھر وہ بولی۔ ”یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے بلکہ پھر باتیں کیسے ہونگی؟“ اتنے دن کے بعد میں نے اس کی شیریں آواز کی میٹھی بانسری سنی۔ اس کی ڈبڈبائی ہوئی پتلیاں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ ماتم کناں ہے۔

میں نے کہا۔ ”موتی میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ لیکن باور کرو جس کے ساتھ تمہارا ازدواجی رشتہ قائم ہونے والا ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ مہتمماری عزت کریگا۔ تمہیں کبھی رکھنے کے لئے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھے گا۔ وہاں جا کر میری تمام باتیں بھول جاؤ گی“

کہنے کو تو یہ کہہ گیا لیکن پھر سوچنے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ اصل ثروت ہے، خوبصورت ہے، تعلیم یافتہ ہے۔ لیکن اس کی محبت مجھ سے فوقیت لے جائیگی، یہ غیر ممکن ہے۔ ان باتوں کو سوچ سوچ کر میرے دل کے شعلے بجی ہو کر آتش فشاں بن گئے۔ اور میں جیسے اس میں جھلس گیا۔ مدہوش شرابی کی طرح اس نے میری انگلیوں کو اپنی مخروطی انگلیوں سے دبا تے ہوئے کہا۔ نہیں، نہیں، کبھی

”نہیں!“

اور میں نے بیتاب ہو کر کہا: ”سوئی! ایسا ہو کر رہے گا۔ مجھ سے جسہ الی اختیار کرنا ہی پڑے گی۔“

اس وقت میرا دل غرور و نخوت سے کانپ اٹھا اور وہ پھر گویا ہوئی: ”بالغہ! بھول گئے وہ دن جب تمہارا ظالم ہاتھ میری پشت پر ہوا کرتا تھا۔ آج بھی مارو اس طرح۔“

کتنے دنوں کی کتنی گزشتہ باتیں میرے صغیر دل میں نمایاں ہو گئیں۔ اور اسی وقت فخر و غرور کا دست چالاک خودی کو ابھارنے لگا: ”فاسخ ہونا ہی ہو گا!“ میں نے ہنستے ہوئے سوئی سے کہا: ”سوئی! اگر تمہیں باور نہیں تو کج حقیقت کھول دیتا ہوں۔ مجھے تم سے محبت نہیں!“

اس بات کی غلش میرے دل کو روند گئی۔ اور وہ ہرنی کی طرح چمک کر بولی: ”کیا کہا؟“

میں نے کہا: ”ہاں سوئی اتنے دنوں تک محقق فریب میں رکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک دن بھی تمہارے ساتھ محبت نہیں کی۔“

یہ سن کر وہ گرجتے ہوئے بولی: ”جاؤ دور ہو جاؤ۔ مجھے بھی تم سے محبت نہیں تم جلاؤ ہو، قاتل ہو، بیدل ہو، جاؤ ہٹ جاؤ میری نظروں سے۔ تمہاری شکل سے اب دلی نفرت ہو گئی ہے۔ بہت تو میں کی تم نے میری محبت کی! اب میں برداشت

ہیں کر سکتی !“

یہ کہہ کر وہ فوراً میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اور میں نے سنا کوئی چکار
آنگن میں دھڑام سے گر گیا۔ اور اس کے حلق سے یہ آواز نکلی ”ماں !“
دریا کے اس پار ایک مابجی دروازہ کھلیٹا گا رہا تھا۔ میں نے بھی اس
کے ٹر میں سڑا کر گانا شروع کیا۔

”مابجی ! ایسا گیت نہ گا۔ دل ہے شیشہ چور نہ کر !“

میری اس فرسودہ اور غمگسار زندگی کو جس میں اضمحلال اور اسردگی کی برف
جم گئی ہے یا تو ساحل میں لاکھڑا کر، نہیں تو اپنی تیز رفتار موجوں میں بہا لیا جا !
دل کے اندر مڑ جائے ہوئے پھول کی جو عنقا کی حلول کر گئی ہے کیا موتی نے
اُسے سمجھا ہے یا نہیں۔

جس کو میں نے اپنے تخیل سے اچھوتا خیال کیا، اپنی خودی سے زیادہ محبت
کی۔ اس کو تحفہ درود دیتے کے لئے جب میں نے اپنی چھاتی کا کاٹا پیش کیا
اس وقت نہ جانے کیوں میرے دل و جگر کے اندر کھٹک اور چھین سما گئی تھی۔
لیکن آہ ! وہ نہ سمجھ سکی۔ میرا دل جس لالہ رخ کے حُسن جہانتاب پر قربان ہوتا ہو
اگر وہ ”بھول“ کو اپنا انیس بنا لے تو بتاؤ میں کس طرح اس جبروت سے بچ سکتا
گا۔ میری وہ زندگی جو خون، آنسو اور آگ کے چشموں میں غوطہ زن ہے۔ اس
کی کامیابی کدھر روپوش ہے۔ صد حیف اس سے بڑھ کر شوریدہ سری میرے لئے

اور کیا ہو سکتی ہے۔

موتی کی شادی ہو گئی۔ وہ دیکھو، اس کام میں محل جس کے اندر لا تعداد
شمعیں منوٹن ہیں۔ اور ایک میری کُٹیا ہے جو تارکا کے اندھیرے دامن میں لپٹی
ہوئی ہے!

بچے بعد دیڑھے گھر کے تمام چراغ شام ہوتے ہوتے روشن ہو جائیں گے۔
لیکن صرف میری کُٹیا چراغ کی روشنی سے محروم رہے گی۔

مزم

ابتداء میں

”یہ کون ہے، کون پری ہے جو سکیاں بھرتے بھرتے پرستان کی جانب بڑھ رہی ہے۔“

آہ! اس کی المناکیاں چور چور ہو کر ہواؤں میں بھی جا رہی ہیں!
 شباب پرورد مینا بدوش آنکھوں میں دکھ کی چنگا ریاں برس رہی ہیں!
 اور دل کے نازک ترین تاروں میں صرف مٹی ہوئی کہانیاں پسج رہی ہیں
 دکھ کے شعلے چھاتی میں مدفون ہیں۔ اور چہرے سے پریشائیاں نمایاں ہیں“

”جھم جھم، رم جھم، رمی رمی رم جھم
 پازیب کی جھنکاریں بج رہی ہیں۔
 اور جب میرے پاؤں کی قوتِ رنقا رسلب ہو جاتی ہے تو وہ باجا بھی میری
 چھاتی میں بجنے لگتا ہے۔“

بھیلر بھمائی جھیسنی جھیسنی
 آنسوؤں کا جھوم مجھے گھیر لیتا ہے اور میں اُداس ہو کر اسے سُنتا ہوں
 میں طوفان ہوں، طوفان ہوں میں! نہیں نہیں میں تو بادل کا بہاؤ ہوں، ہم
 طوفان نہیں!“

م.م.م

بارش کی متواتر مچم کی آواز سن کر یکایک مجھے احساس ہوا۔ ”میرا دکھ
اسی بارش کے سروں میں وابستہ ہے۔“

سامنے گھنا جھل ہے۔ اور اسی جھل میں طافس کے گونا گوں پردوں کی قطار
نظر آ رہی ہے۔ سر کے اوپر ہوا کے دوش میں سارسوں کا غول کا غول پرواز کرتا جا
رہا ہے۔ قدم کے پھول کانٹے میں الجھ کر تبسم کی نشانیاں پھیلا رہے ہیں۔ اور نہ
جلنے کس کے گہرے متوالے گیت کا نشہ سارے جھل کو مدہوش کر رہا ہے!
کیا یہ ساون کا مہینہ ہے۔ ہاں ہاں اسی لئے تو دکھ کی گھنگھو ٹھٹھائیں میری

پلوں میں سمائی جا رہی ہیں۔ اور عیش و عشرت کی نشاط انگیز راگیناں میرے
ازلی ستم رسیدہ دل کو خازنِ ارجیات کے دامن میں سمیٹ رہی ہیں۔

تین سال قبل کی بات ہے۔ میری بیکل زندگی آج بھی پدماکے جھل کی
طرح ادھر سے ادھر منتشر ہوئی جا رہی ہے۔ کبھی اس کی بھولی ہوئی باتیں صنفِ
دل میں منقوش ہو جاتی ہیں۔ اور کبھی میری آغوش میں اس کے نازک جسم کے
س کا داغِ جاگ اٹھتا ہے۔ میرے دماغ کے ریجستان میں جو ہی کے پھول
پھوٹنا نہیں چاہتے۔ نرگس کی کلیاں منزلِ شباب میں آنے سے قبل لقمہ
اجل ہو جاتی ہیں۔ ایک دن میں بھی شباب کے چور اسے پر جب نشاط انگیز
راگنیوں کے چشمے بہا رہا تھا۔ اس کی نسوانی شیریں آواز میرے دل میں پار
اڑ گئی۔ اور آنکھوں سے خود بخود پانی کے دو ایک قطرے ٹپک پڑے۔

وہ دن بھی آج کی طرح ساون کا جانفزا دن تھا۔ میں راہی ازل گھومتے
گھومتے بھٹک کر پگڈنڈی تک آ گیا تھا۔ میں نے دیکھا وہاں کجری کی محفلِ نشاط
جھی ہوئی ہے۔ اور نغموں کی بارش کے پھیٹے فضا کو مست و بخود بنا رہے ہیں۔
آسمان میں سیاہ بادلوں کا ایک ہلکا سا ٹوٹا جھب بخت کی طرح اپنی منزل کھو کر
ادھر ادھر بھٹک رہا ہے۔ اور اسی سہرے آسمان میں نیلے آسمان کا ایک دم
نشان آنکھوں میں جیسے کاجل لگا نئے سوکر اٹھا ہے۔

اسی پگڈنڈی کے قریب مجھ مسافر سے اس کی ملاقات ہوئی۔ نہ جانے

اسے دیکھ کر کیوں مجھے احساس ہوا کہ یہ شکل جیسے جانی پہچانی ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟ کب؟ حافظہ خیال سے یہ باتیں بالکل مفقود ہو چکی ہیں۔ کیا وہ بھی مجھے دیکھ کر اسی سنہرے تخیل میں گم ہو گئی؟ وہی جانتی ہے۔ چلتے چلتے ہاتھوں سے منہ چھپا کر بولی: ”بر دیسی رے تہار (تیرا) دیسی کہاں؟“

اس آواز سے میرا ظاہر و باطن سب بیکل ہو گیا۔ چھاتی میں جیسے ششیر پچھ گئی۔ اور دماغ میں کوہ آتش فشاں پھٹ پڑا۔

یہ کون ازلی جانی پہچانی آواز ہے؟ کیا یہ فریب ہے؟ بادِ مشرقِ قریب سے سسکی لیکر چلی گئی۔

”آہ! بد بخت، آہ! بھولا بھٹکا مسافر!“ بادل کے سیاہ لہراتے ہوئے فحشے کی طرح ملہار کے سر میں دو شیرائیں مل کر گجری گا رہی تھیں۔ اور فضا اس راگنی میں جھوم رہی تھی۔

”گھونگٹ پٹ کھو لو رے سانو ریا!“

مجھے اپنی طرف اس طرح کھڑا دیکھ کر ان کی آنکھوں کی پلکیں کھلی کی کھلی رہ گئیں پھر سیاہ لٹوں کو سنوارتے ہوئے بولیں: ”کجریا رے! کیا تیرا سانو ریا آ گیا؟“ اور اس نے پرے ہٹ کر کانپتے ہوئے کہا: ”نہیں رے بھینیا نہیں، یہ پردیسی جوان...“

اس کی بات کاٹ کر دوسری بول اٹھی: ”کیا اس نے تیرا دل چھین لیا؟“

اب وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ اور میری نظروں سے دور نہ جانے کہاں بھاگ گئی۔ اس راہ میں کھڑا ہو کر حد نظر سے پیسے میں اس کا دھانی رنگ کا سچل اور آسمانی رنگ کا دوپٹہ دوش فضا میں لہراتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی گوندی ہوئی چوٹی کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے صرف کجسریا کی سانولی شکل چمک چمک کر اٹھتی تھی۔ بجل کی خیرہ کن روشنی کی طرح اس کا شہاب چنگاریاں برسا رہا تھا۔

پگڈنڈی کے قریب تنہا میں یہ سوچنے لگا: اس ایک پلک کی نصف محبت کو انسان کس طرح دائمی محبت سمجھ سکتا ہے؟

دوسرے دن اسی پگڈنڈی کے قریب کھڑا ہو کر یہ خیال کر رہا تھا: اچھا، یہ جو میرے دل کی ملک ہے اس کو میں کب اس دن مشرق کی تیز دہندہ ہوا کی موجوں میں بہالے گیا تھا۔ میں نے اسے کب شکست دی تھی؟ کتاب زلیست کا ایک ایک ورق دیکھ ڈالا مگر کہیں اس کی محبت کی کہانی نظر نہ آئی۔ کیا ایک نہ جانے کس طرح میرے دل کے اندر جو ایک "انسان" ہے وہ پہچان گیا۔ وہی میری آنکھوں کے پوٹوں میں آکر بول گیا۔ یہی تو میرے ازلی دل کی ملک ہے۔ یہی تو میرے ازلی حُسن کی دولت ہے۔ . . .

ایک دفعہ پھر میں اپنے خیالات میں غرق ہو گیا۔ اسی وقت درختوں کے سرس میں کجری کی سُرلی تان لہراتی ہوئی فضا کی آغوش میں تر پنے لگی۔

”پڑھے گھٹا گھٹا نور گرج رہا ہے بدردار سے گوری۔“

دم جم دم جم مینا برسے، جیا گھر ائے رما

ہے مینا سے پر میل، ہے کجوار سے ہوری۔“

بلدش کا بادل صاف ہو گیا۔ اور میرا احساس بھی اسی کو گٹنٹانے لگا۔

”میل ہے کجوار سے ہوری۔“ اُف میرے چہان رنگ دبو میں یہ کون

آفتاب تخیل ہے جو رملے انداز سے جاں سپار اور عیاں گسل دل کی تار کیوں کو

منور کر جاتا ہے۔ وہ کون ہے جو میرے آسمان دل میں لانا خدا کنول کھلا جاتا ہو

اور میں گلہائے زنگا رنگ کے سمندر میں ڈوب جاتا ہوں۔

ایک بار اور میں بحر تخیل میں غوطہ زن ہوا۔ دیکھا وہ بادلوں کے جھڑپ

میں محو گل گشت ہے۔ جیل کی سوکھی زمین آسمان کا کلیجہ چیر کر طاس کی سوئی

کے ساتھ چلا اٹھی۔ پانی، پانی!۔“

اُف رے ازلی پیاسی! تیری یہ ختم نہ ہونے والی پیاس کیا تمام سمندر

کے پانی سے بھی نہیں بجھی۔

یکایک میرا مٹا مٹا تخیل کان میں کہہ گیا۔ تم بھی ایک دن اسی طرح

لشہ لب بختے۔ بخاری پیاس بھی بجھنے والی نہیں ہے۔“

بھئی مٹی اور جن کی گہری خوشبو سے جیسے مُردہ جسم میں جان آگئی اس

طرف نرس کی آنکھیں سحر انگیز گیت کا چشمہ بہا رہی تھیں اور بیلے کی بھینی بھینی

کبھی پدمادونہم کی پیاس بجھا آتی۔ لیکن میرے دل کے اندر بارش کا دکھ
ناکامیوں اور ناامیدیوں کی زنجیروں میں بندھا ہوا تھا۔

ہائے کیا کہوں؟ کس کے ساتھ گفت گو کا سلسلہ شروع کیا جائے؟
یہ پاگل من کچھ نہیں جانتا ہے۔ آخر کہنا کیا چاہتا ہے! کس لئے بیقرار رہتا ہے
کس لئے متنا دل اور حسرتوں کے بھنور میں اسیر رہتا ہے۔

آج اور ایک بار احساس ہوا۔ اس نے ایک دن وقت و دواع مجھ سے
کہا تھا۔ ایک دن اور ملاقات ہوگی لیکن شاید تم پہچان نہ سکو گے۔

آج وہی اوداعی بالاسری کی غم آلود موسیقی جاگ اٹھی۔ میری قربت سے
جس دم کجریا اٹھکیں لیاں کتنی ہونی چلی گئی تھی۔ میرے دل میں یہ بار بار تلطم
خیز موجوں کی طرح ٹکانے لگی۔ "شاید تم پہچان نہ سکو گے" اسی لئے میں نے کجریا
کو پکار کر کہا "سنو سنو جان! میں نے تمہارے ان دونوں نینوں کو پہچان لیا ہے"
مگو آہ! وہ آنکھوں میں لہراتے ہوئے سیاہ گیسو بکھرا کر چلی گئی۔ اور اس کی اس
نظر اندازی نے مجھ سے کہا "اس نے بھی مجھے پہچان لیا ہے"

یہ سوچ کر میں اس کی تلاش میں نکل گیا۔ جبینگ کی عجیب جیسی، انسانی آواز
ملہا رکے سڑوں میں ہواؤں کے ساتھ مل جل کر چلی آرہی تھی۔

پھٹائی بدریا چمکے بجری کہاں جاؤں رے گوری!
راہ میں ٹھہر کر میں نے دیکھا۔ آسمان سے ہزاروں آبشار کے قطرے

ہنگامہ برپا کر رہے ہیں۔ جھم جھم، ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ آسمان کی گود میں ہزاروں کنواری لڑکیاں پازیب کی جھنکار کے ساتھ رقص کر رہی ہیں۔ پھر دوسری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہی عکس رخ یا اپنی عشوہ گری میں مگن، درختوں میں جھولا ڈال رہا ہے۔ آج وہاں کوئی بندھن نہیں ہے۔ ہر ایک اپنا حجاب آنسو دھوٹھٹا ہٹا کر لجاتی ہوئی چیتوں سے دعوت دیدے رہی ہے۔

جی چاہتا ہے کہ اُن تک جاؤں اور کہوں۔ دیوی، پھر وہی نغمہ حیات سناؤ جسے سن کر میرے دل کی رزش تیز تر ہو جاتی تھی۔ ساون کی اہلبھاتی ہوئی فضا میں زندگی اور روح میں آگ لگا رہی ہیں۔ میرے شباب کے جوار میں موجیں ٹپنے لگیں۔ اور ان محبوب لیکن محبت کی دیویوں سے مس ہو کر وہ ہوائیں میرے جسم سے ٹکرائے گیئیں۔ آہ! پھر میری آنکھوں میں ان کے وجود کی نشانیاں کیوں نمایاں ہو گئیں۔ پھر جذباتِ خفہ میں انکار سے کیوں سلگنے لگے۔

شباب کی آغوش میں پلے ہوئی دوشیزائیں سیاہ بادل اور نیلے آسمان کا راگ الاپ رہی تھیں۔ پیل کے درخت کی پتیاں ایک دوسرے سے ٹکرا کر ان کے سرے لیے راگ کے لئے سراپجا کر رہی تھیں۔ ان کے دلوں کے گوشہ میں بادلوں کی جذباتی رفتار سما گئی تھی۔ اور ان مناظر کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو کے قطرے اُمٹ اُٹے۔ میں نے اسی سیاہ کجرا کو دیکھا۔ جھولے سے اتر کر وہ میرے قریب آ رہی تھی۔ بالآخر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول اُٹی:

”جنیارے ہی سندر پر دیسی۔۔۔“ یسن کر اس کی ہیلی بادلوں کے جھرمٹ میں تبسم کی سرخیاں پھیلا کر بولی : ”ہاں ری کجریا۔ تیرا سنوریا۔“ کجریا بجا کر موتیا کی لٹٹیں کھینچے ہوئے درخت کی آڑ میں چھپ گئی۔

میں سوچ رہا تھا : ”شاید انسان اور بادل کی باتیں اسی طرح ہوتی ہیں“ میراظم آلود دل اس سیاہ بادل کو ہمدم کہہ مخاطب کرنے لگا۔ پھر چونک کر میں نے دیکھا وہ میرے بالکل قریب کھڑی تھی۔ اس کے کنارے ہونٹ قرقر رہے تھے اور آنکھیں تمناؤں کی دنیا میں جاگ رہی تھیں۔ یکایک مجھے احساس ہوا۔ اس اندھیرے اور تاریک بادلوں کی قطار میں صرف میں اور وہ موجود ہیں۔ جھل سسنان ہے، خاموشی چاروں طرف مسلط ہے۔ کہیں کوئی نظر نہیں آتا۔ اوپر، نیچے، چاروں طرف صرف بادلوں کی سیاہ گہری نشانیاں کہیں کہیں ابر کو فضا میں میرے کان میں کچھ کہہ جاتیں اور میں جذبات کی دُنیا میں مستغرق ہوتی ہوں۔ شاید اسی جانی پہچانی جگہ میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اور یہیں ہمارے احساسات کی دُنیا میں جنگ کی تباہ کاریاں اہم دونوں کے مابین گفت گو کا ایک رنگین سلسلہ شروع ہوا۔

میں نے کہا : ”کجریا، تمہیں بہت جستجو کے بعد پایا ہے“ بادلوں کا سیاہ ٹکڑا جو میری باتیں سن رہا تھا۔ یکایک کانپ اٹھا۔ زخم خوردہ ہرنی کی طرح روتے روتے کجریا میری نظروں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ لیکن بھاگتے وقت اتنا کہتی گئی۔

”نہیں رے سندر پر دہی میں کالی کجریا ہوں“ اس کی زبان کچھ اور بولنے والی تھی۔ مگر اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی۔ وہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔ ایک طوفان تھا جو میری زندگی کے تمام سرمایہ کو خس و خاشاک کے ساتھ بہا بے لئے جا رہا تھا۔ ایک سیلاب تھا جس نے میرے بھر تخیلات میں ہنگامہ برپا کر دیا۔

مکمل ایک سال تک اس سے ملاقات نہ ہوئی۔
 آج سادون کی رنگین فضاؤں میں میرے جذبات بیدار ہو کر کڑویں بدل رہے تھے۔ اور یوم جدائی کی ساری باتیں رہ رہ کر سکون کی گھڑیاں درہم برہم کر رہی تھیں۔ آج میرے سر ہانے کا ٹٹا ہوا چراغ ہوا کے تھپڑے سے کانپ رہا تھا۔ آہ! آج میں تنہا ہوں۔ نشاط انگیز انگیناں دم توڑ کر جیسے سینے میں قبر بنا چکی ہیں۔ اور احساس نشوونما پا کر عہد رفتہ کی آغوش میں لوٹ رہا ہے۔ میرے لئے وہی دن مہانا اور خوش آئند تھا جب میں ملکہ دل کی راگنی بھری زبان سے نیش آلود باتیں سنتا تھا۔ آہ، کون ہے جو اس ولد و زمنظر کی تاب لا سکتا۔ کس کا دل وجگر ہے جو نفرت کے چھادینے والے الفاظ سن سکتا۔ جس کے دل کے اندر دکھ کی چتائیں نہیں جلیتیں۔ وہ دوسروں کے دل کے دکھ کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ کون

جان سکتا ہے۔

اس نے مجھ سے کہا تھا: دیکھو پر دہی مسافر میں بالکل سیاہ ہوں
اسی لئے لوگ مجھے کھریا کے نام سے پکارتے ہیں۔ میں اس زخم کو برداشت
کر لیتی ہوں۔ اس نفرت انگیز نام کا نیش سہنے کی مجھ میں قوت ہے۔ مگر اے
انجان اور بھولے مسافر! تم یہ کہہ کر کیوں میری تذلیل کرتے ہو کہ ہمیں
مجھ سے محبت ہے۔ اے مرقعِ حق! تم کیوں اس بد نصیب اور ابھائی
کو حقارت آمیز نظروں سے گھورتے ہو۔ میں اس تحقیر کی لاج کہاں چھپا کر
رکھوں۔ ہاں جانتی ہوں میں سیاہ کوئلہ ہوں۔ پھر تم مجھ سے محبت جتا کر
مجھ شرم وندامت کی اندھیری دنیا میں کیوں پھینک رہے ہو۔ جی! جی! —
مجھ سے محبت کرتے ہو۔ مگر سن لو! اوشیام سندر! تم مجھ سے محبت نہیں
کر سکتے۔ میں محبت کی قیمت نہیں دے سکتی۔ آہ! مجھے اس طرح محبت
کی تیز چھری سے گھائل نہ کرو۔ میرے دل کو زخمی نہ کرو۔ یہ میری تذلیل
نہیں ہے بلکہ میری محبت کی تذلیل ہے۔ اور اس تذلیل کو کوئی برداشت
نہیں کر سکتا۔ اچھا شیاما الوداع! الوداع!!

میں نے دل ہی دل میں کہا: اے مغرور لڑکی! سنو! ہمیں غور کے
احساس نے اندھا کر دیا ہے۔ اس لئے تم میرے دل کے بھٹکتے ہوئے
دل کے انگارے کو دیکھ نہ سکیں۔ تم نے میری محبت نہ پہچانی۔ میں بھی

مہتاری طرح سیاہ ہوں۔ مگو تم اپنی زبان سے مجھے خوبصورت کہتی ہو۔
 مرق حُن کہہ کر پکارتی ہو۔ مہتیں کیا حق ہے کہ مجھے سندر کہو۔ کیا یہ میرے
 لئے تذلیل کا باعث نہیں؟ تم اپنی آنکھوں سے جس طرح مجھے سندر
 دیکھتی ہو۔ سن لو اے احمق! کہ میری آنکھیں بھی تمہارے اندر اس سے
 زیادہ خوبصورتی کا عکس دیکھتی ہیں۔ میں نے تمہارے اس سیاہ روپ
 کو ایک مدت دراز کے بعد ڈھونڈ نکالا ہے۔ اور اب تم پھر میری
 آنکھوں کے سامنے میرے دل کو دارغ مفارقت دیئے جا رہی ہو۔ کیوں
 بولو، بولو ظالم! کیا اسی طرح مہتیں سکون ملتا ہے؟ کیا میرے دل کو کٹند
 چھری سے ذبح کر کے تم شانی حاصل کرنا چاہتی ہو۔ نہ جانے میرے اوپر
 تمہارا کیا حق ہے کہ ہر وقت، ہر لمحہ تخیلات میں موجود رہتی ہو! آہ تم مجھے
 اس طرح چھوڑ کر نہ جاؤ۔ نہ جاؤ جان! جس کو محبت پر یقین نہیں اس پر تو
 فخر نہیں دکھایا جاسکتا۔ جسے میں پہچانتا ہوں اور جس پر میرا حق ہے اس
 پر تو مجھے فخر کرنا چاہئے۔ اس پر غصہ کی چنگاریاں برسانی جاسکتی ہیں۔ جسے
 میں دل اور آنکھوں دونوں میں جگہ دیتا ہوں جسے میں اپنے احساس
 کی قندیل بھتا ہوں۔ وہ مجھے کیوں نہیں چاہتی۔ کیوں وہ بھی مجھ سے
 اتنا نہیں کہتی۔ ہاں میں بھی مہتیں چاہتی ہوں۔

مگر آہ! وہ میری تمام باتیں سن کر بھی نہ سمجھی اور چلی گئی۔ یہ عز و رو

داہنے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر کہنے لگی : "اے پروردیسی شہیاد! میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم نے سچ کہا تھا۔ ہاں! ہاں!! مجھے تم سے محبت ہے تم مجھ کو محبت کرتے ہو۔ حقیقی محبت!"

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں کے پوٹوں میں حقیقی محبت کے آنسو اُٹھ اُٹھ آئے ہیں۔ اور وہ تھر تھرتھرتے ہوئے ہونٹ صبح کی شمع کی مانند ہلکی مسکراہٹ کی بارش کر رہے ہیں۔ آہ! اتنی طویل جدائی کے بعد اس کٹھور اور میرحم نے مجھے پہچانا۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں سے بھی خوشی کے قطرے ٹپک پڑے۔ لیکن میرے آنسو کا ایک قطرہ جب اس کے نازک ہاتھ پر گرا وہ فوراً تڑپ کر میری آغوش میں آگئی۔ اور خوبصورت پھولوں کی نازک شاخیں اور رزگس کی پتیاں اس کے سر پر لہرانے لگیں۔

پھر ایک انقلابی لیکر کہنے لگی : "تمہیں کیا معلوم کہ میری زندگی کا ایک گان بار سال کس طرح گزرا۔ روز صبح جہنا میں اشتنان کرنے جاتی۔ اور تمہاری یاد سے میرا سینہ دھڑک اٹھتا۔ آنکھیں کپکپا جاتیں۔ خیالات کا اسپتیزو دوسرے بھاگ جاتا۔ میرے دل کو آج وہی آگ، وہی نیش، وہی غلش بار بار بیکل بنا جاتی ہے۔ میں روز بکھتی ہوں۔ میرا پروردیسی ضرور آئیگا۔ وہ جس کا گیت فضا میں لہرا رہا ہے۔"

اور میں نے اس کے ہاتھوں کو جنین دیکر کہا : "کجری مجھے چھوڑ کر مت

جاؤ۔“

یہ سن کر اس کے دونوں ہونٹ ہنسنے ہنسنے مٹھ مٹھانے لگے۔ میں نے دیکھا کہ دُکھ کی شدت سے مجبور ہو کر وہ آنکھوں پر آنچل ڈالے رو رہی ہے اور آنسوؤں کے آتشیں قطرے رخسارِ احمر میں سے دھلک کر فرشِ خاکی کو غم کر رہے ہیں۔ پھر میں نے دیکھا۔ اس کی دونوں آنکھوں میں پاکِ تبسم کی نشانیوں دوڑ گئی ہیں۔ مجھے احساس ہوا۔ شاید اس کا یہ تبسم پہلا تھا۔

اس کے بعد اسے پھر نہ جانے کیا خیال آیا کہ یکبارگی اس کا سارِ تبسم دُکھ کی تاریک کیمبرِ منوم ہو گیا۔ اور وہ کانپتے کانپتے بولی: ”نہیں شامِ سندر نہیں، مجھے جانا ہی پڑے گا۔ مجھے تم اپنی محبت کا حقیقی غریب لکھ جانے دو۔ چھوڑ دو مجھے۔ چھوڑ دو پیارے۔ آہ!“

میری آغوش میں اس کا تھکا ہوا سر لوٹنے لگا۔ اور اس ازلی دوشیرہ کو میں نے سینے سے لگا لیا۔ یکایک جیسے فضا کے ذرے ذرے میں یہ آواز گونج گئی: ”اُف! اُف! اُف! اُف!“

مجھے احساس ہوتا ہے کہ محبت کے حاصل کرنے کے فخر نے اُسے زندہ نہیں رہنے دیا۔ وہ آج نہیں ہے بلکہ موت کے منہ میں جا کر سیاہ انسان کے خالق کے پاس چلی گئی ہے۔ اب وہ باطنی روپ کا تحفہ لیکر شاید آج میرے انتظار کر رہی ہوگی۔ سیاہ انسان کا پندار ہمیشہ پوشیدہ رہتا ہے۔ وہ اپنے سیاہ

روپ کی وجہ سے سمجھتا ہے کہ اس سے کوئی محبت نہیں کر سکتا۔ اگر کسی نے اس کے ساتھ محبت کا راگ چھیڑا تو اسے یقین نہیں آئے گا۔ ایسے انسان کی زندگی میں یہی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔

آج بھی سادون کا مہینہ آیا ہے اور میرے لوحِ دل میں روزِ اول کی گجری کا راگ منعوش ہوتا جا رہا ہے۔ ”گھونگھٹ پٹ کھو لو مورے سانویا!“ اُف رے پردیسی سانویا۔ بہتا راہِ گھونگھٹ زندگی میں نہیں کھلا۔ نہ کبھی کھلے گا۔

آج جب میری بیکل آنکھوں کے سامنے آسمان کی لہریں تڑپ رہی ہیں مشرق کی ہوا ”ہو۔ ہو۔“ کر کے جدائی کی دلِ دوز راگنی میں بہتی آرہی ہے۔ ہمارے مڑوں میں جیسے کسی بھکارن کی چنج کراہ کر نکل گئی۔ ”پیارے! سامنے میری منزل نہیں، انہیں۔ جان!“

دائمی بارش کی بیکل دھاریں بہہ رہی ہیں۔ دِلنواز! تم اتنے دنوں تک کہاں تھیں۔ اس سال بارش کا بادل میری نظروں میں اس طرح دکھائی دے رہا ہے جیسے دل میں بہت سے تیر چلا دیکا۔ آخر کیوں؟ آہ میری گم شدہ چٹم متنا۔ بہتا رے دل کا راز حسین ترین راز میں نے اس بادل میں سنا ہے۔ سنا ہے جان!

یہی تو تمہارے حسن کی جھلک ہے۔ رانی! دیکھو تمہاری آنکھوں
 کا سیاہ کاجل میری آنکھوں کے پوٹوں میں بہہ کر آ گیا ہے۔ جانِ حیات
 مجھے تم نے بار بار دل کے دس میں گم کر دیا تھا۔ اس دفعہ تو میں نے تمہیں
 آنسوؤں کی لڑیوں میں باندھ دیا ہے۔ اب بھاگ کر کہاں جاؤ گی۔ لہے
 کی زنجیریں میں نے ہمیشہ کاٹی ہیں۔ مگر میں تم کو۔ اے مکتی بن کی شریر
 بچھی۔ آنسوؤں کے بندھن میں باندھ کر مقید نہیں کر سکوں گا۔ دیکھو میں نے
 تمہیں اس گہرے نیلے بادل کی آغوش میں، رنگس کی سبز پتیوں کے اندر
 اور بھیگے ہوئے دھان میں پایا ہے۔ دیوی! تمہارا یہ شام! اپنے سحر انگیز
 حُسن کہاں چھپائیگا۔ یہ سنہرا آسمان — یہ سبز میدان، یہ شام کا ڈوبتا
 اُفق۔ ان ہی چیزوں میں تمہارا شام ہمیشہ ملے گا۔ سنو! آج میں ساون
 کے رنگیلے دھان کے کھیت میں بیٹھ کر گارہا ہوں :-

میری آنکھیں درد و غم سے رو رہی ہیں بار بار
 کھو دیا ہے کیا حقیقت میں محبت کا پیار
 پیش قدمی کر رہا ہے پھول کا درد نہاں
 غنچہ رنگس ہیں دیکھو آج کیوں شبنم نشاں؟

جو ہنی میں نے آنکھ بند کرنے کی کوشش کی اچانک بارش کے بڑے
 بڑے قطرے ”رم جھم“ گرنے لگے۔ ایسا ہی شور تھا اس دن بھی جیسا شور

آج کی بارش میں ہے۔ آسمان کا سمندر جیسے اُلٹ گیا ہے۔ شاید اب بارش
 نہیں رُکے گی، نہیں تھمتے گی۔

بارش کی بوندوں میں کانپتے کانپتے میں نے دیکھا۔ آنکھوں کے
 سونے بحر تخیلات میں دریا نے پد ماہوتا ہوا چلا جا رہا ہے۔

سلاخوں کے پچھے

ابتداء

جانِ حیاتِ مہتاری ہی وجہ سے تو نامعلوم دکھ کا آتش فشاں پھٹ پڑا ہے۔

بولو! میرے ساتھ تمہارا یہ فریب مہتیں زیب دیتا ہے؟
نہ جانے کیوں تمہارے شروفساد کی ستم رانیاں مجھے مسکیاں لینے
پر مجبور کرتی ہیں۔

آنکھوں سے قطرہائے اشک بہتے ہیں۔ اور کلیجہ کٹ کٹ کر خون
کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے۔

ہاں، ہاں مجھے اپنا یہ دکھ معلوم ہے

تم بھی جانتی ہو جانِ تمنا

پھر اتنی کٹھور اور سنگدل کیوں ہو؟

سمجھ میں نہیں آتا، میری سمجھ میں نہیں آتا۔

شرم و حجاب ہے یا غرور و نخوت!!

جب مجھے احساس ہوتا ہے کہ مہتاری نفرت میرے لئے کس قدر

وجہِ جانکشی ہے۔

اس وقت چھائی کے اندر شمشیر کی انی چھیتی ہے اور خون سے چسپ

نکل جاتی ہے۔

میں مہتاری جتنی ضربیں سہتا ہوں
 تم اور سنگدلی کا مظاہرہ کرتی ہو
 اچھا جان سناؤ، اچھی طرح میرے دل کو مسل ڈالو
 دیکھو مہتاری ضرب کا نشان
 اب تک دل کے پردے میں نمایاں ہے ۔

سلاخوں کے پیچھے

پریسڈنسی جیل - کلکتہ
آزادی کے دن کی آخری گھڑی!

جانِ حیات!

آج مفارقت کی دلدوز گھڑی ہے۔ یکے بعد دیگرے میں نے سبھوں کو خدا حافظ کہہ
صرف تم باقی ہو۔ آہ تم۔ میں نے سوچا تھا کہ جدائی کے دن تمہارے شیشہء دل کو عہدِ فرستہ
کی المِ انجیز یوں سے پاش پاش نہیں کروں گا۔ لیکن افسوس تمہارے ساتھ سلسلہء کلام
تک نہ ہوا۔ کاش! صرف ایک بار، تمہاری مینا بدوش آنکھوں اور احمس لبوں سے تفتیشی

شوق بجھا سکتا۔ لیکن مجھے خوف ہے کہ میرے ان زخم خوردہ الفاظ کو سن کر تم
خجرا بدار سے اپنی چھاتی چیر ڈالو گی۔ اور محسوس کرو گی کہ میرے حافظہ میں اب
نیک ماضی کی تلخیاں کر ڈھیں لے رہی ہیں۔ اور ملاقات کی آخری گھڑیاں تصویر
دروہن کو آنکھوں کے سامنے عکس ریز ہیں۔

میری گفت گو سے بہتارے دل کو کبھی سیرابی نہیں ہوئی۔ شاید آج بھی
میرے خط کے الفاظ نیش عترب ثابت ہوں گے۔ لیکن جان! اس خط کے ایک
ایک لفظ کو غور سے پڑھنا کیونکہ اس میں ایک پریشان خاطر بھکاری، رنجور، مسافر
اور مظلوم خانہ بدوش کی غناک راگنی کی جھنکاریں سمائی ہوئی ہیں۔ میں نے اس
کے اندر اپنا کلیجہ اتار ڈالا ہے۔ آج میں بہت کٹھور اور ظالم بن گیا ہوں۔ کیونکہ
میں دکھ اور درد کی غلش سے تڑپ رہا ہوں۔ وہ دکھ جس نے مجھے باغی بننے پر
بجھو دیا ہے۔ موجودہ شہنشاہیت سے نبرد آزمائی کرنے پر ابھارا ہے۔ میں
آج دریا کے بیل تھپیڑے کے مانند محنت چٹان کا کلیجہ چاک کرنے میں کامیاب
ہو گیا ہوں۔

وہ انسان جس کی کتاب زندگی کا ہر صفحہ ہوا کے دوش پر منتشر ہو رہا تھا
آج وہ ان منتشر صفحات کو ترتیب دے رہا ہے۔ کتنا احمق ہے وہ انسان۔ لیکن
یاد رکھو اس کا یہ آغاز انجام کی شکل میں نمودار ہو گا۔ اور پھر یہی انجام آغاز بن
جائے گا۔

اس وقت جبکہ میں آہنی نب سے کاغذ کاٹنے چیر رہا ہوں ماضی کی کہڑوں
نصویریں دعوت دیدے رہی ہیں۔ اور ان تصویروں میں شام کا ایک ہندلا
سامنظر یاد آ رہا ہے۔ جس وقت تم نے مجھ سے دریافت کیا تھا۔ ”کس طرح
تندرست ہو گئے؟“

مہتاری کنواری زبان سے اپنی علالت کا حال سن کر میری کمزوریوں
پرسنی پھیل گئی تھی۔ اور جیسے کسی نے میرے گالوں پر طمانچہ رسید کئے تھے۔
اور گھر کی شکستہ دیوار کو دیکھ کر سوچنے لگا تھا۔ ہائے میری زندگی کے صفا و
شفاف آسمان میں سیاہ بادل۔ ہائے میری محبت میں گھناؤنی شکل! میں
نے مہتارے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ اور دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔
یقین مانو اس وقت میرے دکھ کے مندر میں جیسے سینا سی کی بے ثمر بار زندگی
چخ اٹھی تھی۔ اور غم آلود زندگی کا سربستہ دکھ یکایک منتشر ہو کر فضا میں سکنے لگا
تھا۔ جس کے لئے میرے سینے میں اتنا دکھ ہے۔ جس کی خاطر میں نے اپنا شباب
لٹا دیا۔ وہ آکر پوچھتی ہے۔ ”کس طرح تندرست ہو گئے؟“ آہ!

یہ سن کر میں نے نیند کی شیریں آغوش میں کھوجانا چاہا۔ کیونکہ مہتاری
مسرور آنکھیں میری اشک بار آنکھوں کو گھور رہی تھیں۔ میں تم سے کس طرح
کہوں کہ تمہاری قربت میرے سکون کو اور سترزل کر دیتی ہے۔ جس کو میرے
درد و دل کا احساس نہیں، جس کے پہلو میں رحم و کرم کا خمیر نہیں۔ وہ بیدرداؤ

سفال شکوں کی روانیاں کیوں دیکھے، وہ دُکھ کے سُرخ انگارے پر آبِ پاشی کیوں کرے۔

میں نے دیکھا چند لمحے تک غم کھڑی رہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ رخصت ہو گئیں۔ شاید میرے ان الفاظ کو پڑھ کر تمہاری محوِ بلبلیں شباب و شعر کی بادہ پرور فضا میں ناچ رہی ہوں گی۔ اور تمہاری گداز چھاتیوں کے اندر ہزاروں میخانے تیر رہے ہوں گے۔ لیکن آہ! میری حالت نہ پوچھو۔ میں ایسا بھکاری ہوں جس کا دل امدھا اور گونگا بن گیا ہے۔ اگر میرا دل امدھا اور گونگا نہیں ہے تو پھر میں نے بن کبے تمہارے سامنے کیوں آنکھیں موند لی تھیں۔ تمہاری رخصتی کے بعد نفرت و حقارت اور رنج و عن کا چراغ جلا کر شکوں کی لڑیاں پرونے لگا۔ اس وقت آفتاب کا شباب ڈھل چکا تھا۔ اور تاریکیاں روشنی پر حاوی ہو چکی تھیں۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر آیا۔ دوست و احباب آئے۔ بھوں نے کہا۔ پیٹ کی انٹریاں اپنی جگہ سے ہٹ گئیں۔ لیکن ڈاکٹر بولا۔ "نہیں مریض کا دل کسی بیک یک حادثہ سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہے! اس کا انجام دردناک ہوگا۔۔۔"

ڈاکٹر کے باقی الفاظ میں نے مکمل کرتے ہوئے کہا: "ہاں قدیل حیات کی تدھم روشنیاں بہت جلد دم توڑ دیں گی ڈاکٹر!" "نہیں نہیں" میں نے کسی کی غم آلود آواز سنی۔ میرے حواس منتشر ہو رہے تھے، رفتا رنجن میں

سرعت آگئی تھی۔ اور میں سوچنے لگا تھا: کیوں؟ آخر آج اتنی ہمدردی کیوں کیا واقعی وہ ” میری پلکیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ اور اس کے بعد میں اُداس ہو کر سو گیا۔ تمام دوست و احباب رخصت ہو چکے تھے۔ عالم خواب میں مجھے محسوس ہوا کہ مہتاری شہابی انگلیاں میرے سینے پر رکھی ہوئی ہیں۔ اور مہتاری بادہ ریز آنکھوں میں لالچند کنول کھلے ہوئے ہیں میں نے فرط محبت میں ندغم ہو کر مہتارے گلے میں باہنیں ڈال دیں اور پکارا تھا ”جانِ حیات! جب پلکیں وصال کے مزے اٹھا چکیں اور ایک دوسرے سے جدا ہوں۔“ میں نے دیکھا، ایک خدا ہے، جہاں میں اٹھب تخیل دوڑ رہا ہوں۔

اس دن سے میں نے بہتیری کوششیں کیں کہ مہتیں ایک بار ہی اپنی چھاتی سے بھیغ لوں۔ ایک بار ہی انمیتیاہوں پر شیریں بو سے پیوست کر دوں مگر آہ! یہ سوچ سوچ کر دل تیزی سے دھڑک اٹھتا اور میں ایک جھجھکار کر بیہوش ہو جاتا۔

کچھ دیر بعد میں نے نوگوں کے سامنے ماضی کی داستان کا آغاز کیا۔ اس وقت میرے چہرے پر بشارت تھی۔ اور میں ہنس ہنس کر سبھوں سے مخاطب ہو رہا تھا۔ مہتیں میری اس یکا یک تبدیلی پر ضرور حیرت ہوئی ہوگی کیونکہ میں مہتارے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ اگر واقعی یہ بات تھی

تو کیوں نہیں مجھ سے کہہ دیتا تھا تاکہ میری یہ جاں سپاس زندگی جو ”دیو داس“
کا جاں گسل منظر پیش کر رہی ہے مٹ جاتی۔ آہ! میری نامتوام اور شکست
خوردہ زندگی!

ایک دن جب میری آنکھوں سے جلیترنگ کی موسیقیاں ابل رہی تھیں
مجھے احساس ہوا کہ میں تم سے یہ کہہ رہا ہوں:

”میری راہ پُر از آشوب کیوں ہے۔ سارا دن بھتیں پانے کے لئے
بیکل رہتا ہوں اور تم یہ دریافت کرتی ہو۔ کس طرح تندرست ہو گئے؟“
دن کے ڈھلے ڈھلے میرا دل بھی ڈوبا جا رہا ہے۔ آنسوؤں کی بشار
لڑیاں فرش خاک پر گر کر جذب ہو گئی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا جان! کہ سینے
میں کیسی ہلچل پیدا ہوئی ہے۔

مجھے گمان ہو رہا ہے کہ اس وقت تمہاری نس نس میں شباب کے
سیمیں قہقہے سمائے ہوئے ہونگے اور تمہاری شرابی آنکھیں فرط مسرت میں
رقص کر رہی ہوں گی۔ ہنسو، خوب ہنسو! یہاں تک کہ دُنیا کا ذرہ ذرہ تمہاری
نظروں میں گھومتا نظر آئے۔ عورت کا شباب کیا ہے؟ قہقہے اور مسرت
کا بیج! لیکن ایک میں ہوں کہ آہنی سلاخوں کے اندر زندگی کے شکستہ پہرے
کو گھسیٹ رہا ہوں۔ اپنی حرماں نصیبی کا ماتم کر رہا ہوں! کتنا بد بخت اور کتنا
بد نصیب ہوں میں! لیکن یاد رکھو تمہارے نکھرے شباب کے رو پہلے دن

اور رات ایک دن جاب آسا بن جائیں گے۔ تمھاری رنگین خوشیوں اور شیریں قہقہوں میں بجلیاں کوند اٹھیں گی۔ اس دن تم یاد کرو گی اس دھکی انسان کو جو آج تمھاری کھٹا بردوش نککا ہوں میں حقیر ہے۔ اور اسی دن تم اس کی محبت کا راز سمجھو گی۔

جس وقت میرے نغمہ بار ہونٹ ہو امیں تھر تھرا رہے تھے اُس وقت میں نے دیکھا ایک نامعلوم ہاتھ میرے بہتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس ہاتھ کا لمس اتنا پیارا اور فرحت بخش تھا کہ میرے دل کی ساری چنگاریاں سرد ہو گئیں۔ اور میری زبان سے یہ آواز نکل پڑی۔

”اے میرے مالک! کیا آج شام کی آرتی بے شر بار نہیں جاسکتی؟“

بتاؤ میری کلی یہ کس کا نازک ہاتھ تھا۔

شاید تمھیں یاد ہو گا کہ ایک دن میرے پہلو میں آکر تم نے اپنا باریک حنائی آنچل سے اپنا رخ زیبا چھپا لیا تھا۔ کیوں؟۔ شرم و حجاب سے؟ یا سکھ پا کر! یاد رکھ کی شکل دیکھ کر! سمجھ میں نہیں آتا آخر کیوں؟ میری اس نا سمجھی ہی نے تو مجھے اتنا مضحل بنا دیا ہے۔ بڑی ننوں اور خوشامدوں کے بعد تمھارے لب کو جنبش ہوئی تھی۔ لیکن پھر شرم سے تم نے منہ کو چھپا لیا۔ اگر اس دن تم دروغ بانی ہی سے کام لیکر کہہ دیتیں صرف اتنا۔ ”میرے پیارے!“ نہیں نہیں۔ جلنے دوان فرسودہ باتوں کو!

اس جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں جہاں میں سٹربا ہوں دل و دماغ میں شاعری کا آبشار پھوٹ رہا ہے۔ اور میرے لبوں سے حسین نظیں فضا میں بلند ہو رہی ہیں۔ شاعری کی اس نئی تخلیق کو مختاری محبت کا اعجاز کہوں یا کیا۔ لیکن شاعری کے رس کو پا کر بھی میری زندگی پریشانیوں کا مرقع کیوں ہے؟ کیوں ہمیں آسمان زندگی میں جگنو چمکتے اور ستارے قہقہہ لگاتے؟ کیوں ہمیں تحنیل محبت میں نقرئی قہقہے اٹکڑائیاں لیتے؟ میرے ان بے ربط الفاظ کو پڑھ کر تم سوچ رہی ہو گی کہ مختار المستخر اڑ رہا ہوں۔ ہمیں جان ایسا خیال نہ کرو۔ جب میں نے یہ جان لیا کہ مختاری گھنیری دراز پلکوں میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں نے اپنی خودی سے محبت کرنی شروع کی۔ یہی میری محبت ہے۔ اور یہی پسندار محبت۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لوگ اب مجھے نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔

نہ جانے کتنی کنواری البیلی دوشیزائیں میری خاردار راہ میں آئیں، اور ان کے نازک اہم میں ہونٹوں سے محبت کے کشش انجیز راگ پھوٹے۔ لیکن میں نے آنکھیں موند لیں اور کان بند کر لئے۔ کیونکہ میں بندہ خودی ہوں اور یہ بھی احساس ہوا تھا کہ حسین ناگنیں تو میری ہر کاب نہیں ہو سکتیں۔ پھر کیوں میں ان کی رس بھری جوانیوں کو چوس لوں؟ اس لئے ہی میں ان کے دامن فریب سے دور بھاگ گیا تھا۔ مبادا ایسا نہ ہو کہ میری محبت کا چھاپ

ان کے دلوں میں منقش ہو جائے اور انجام کارِ شیمانی کا منہ دیکھنا پڑے۔

میرا برسوں کا تجربہ ہے کہ جب بھی میں نے کسی حسین چیز کو دیکھا جس

جہاں تاب پر نگاہیں پڑیں، میری خودی فوراً اسیر ہو گئی۔ اسی لئے جب بھی میں

دیکھتا ہوں کہ محبت کا دیوتا اپنے ترکش کا تیر میرے جگر میں پیوست کرنا چاہتا

ہے میں اس راہ سے کتر اجاتا ہوں۔ اسی کش مکش میں میں نے بہتوں کو

بھلا دیا۔ میرے ساتھ بے شمار کنواری دوشیزاؤں نے محبت کا اظہار کیا۔

لیکن میں نے سبھوں کے دلوں کے اندر بیوفائی کی بو پائی۔ میں مسافر

ہوں، آوارہ ہوں، صحراؤں میں ہوں۔ اور اسی صحراؤں میں میرے

ساتھ ایک دل نے پیمانِ محبت باندھا۔ لیکن صدحیف کہ وہ میری محبت نہ

پاسکی۔ ان باتوں کو دیکھ کر سب نے مجھے مغرور کا لقب دیا۔ معلوم نہیں کیوں

اور جب میں نے محبت کی حسین لڑیوں میں سما جانا چاہا تو میری چھاتی میں

سنوائیت کی ٹھوکروں کی شدید ضربیں لگیں۔ اور میں جناب کی طرح پل

بھر میں چور چور ہو گیا۔

کتنی حسین دوشیزاؤں نے مجھے اپنی وقرب رانگیوں اور حسن کی لازوال

لہروں میں مدغم کرنے کی کوششیں کیں۔ لیکن میرے دل نے ان کی موسیقیوں

کی جھنکاریں نہیں سُنیں۔ کیونکہ ہمیشہ میرے ضمیر سے یہ آواز بصد ہنگامہ نائل

پر واز ہوتی ہے۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔“

ہائے میرے غیر آسودہ دل! پھر تجھے کس کی کی تلاش ہے؟ تیری آنکھوں
 میں کس کا جلوہ رقصاں ہے۔ وہ مغرور کون ہے جو صحن میں پھولوں کا ہار لیکر
 فرشِ راہ ہے۔ میرے دل کی جو ملکہ ہے اُسے نہ پا کر ہی میری یہ زندگی
 نشاط و عیش کے مرمیوں میں جلووں سے دوہو گئی ہے۔ آج میرا یہ احساس مجھے
 بیکل کر رہا ہے کیونکہ میں نے ان کنواری دوشیزاؤں پر نگاہیں کیوں ڈالیں۔
 انہیں کے عکس جمیل نے تو میرے ذہن و فکر کو روند ڈالا ہے۔ لیکن یہ یاد کر کے
 مجھے کچھ سکون ضرور ہوتا ہے کہ میں نے کسی کی بے عزتی نہیں کی۔ کسی کے
 معصوم دل کو اپنی محبت میں اسیر کر کے بے دردی سے نہیں ٹھکرایا۔ بلکہ میں
 نے ہی دست بستہ اُن سے معافی مانگی۔ اور ہمیشہ ان کے مقدس حُسن سے
 کتر اتار رہا۔ کسی دن بھی ان کی راہوں میں خلیج بن کر حائل نہیں ہوا۔ کبھی میں نے
 ان کی قربت حاصل نہیں کی۔ میری اس خودی کو دیکھ کر بے شمار زبانوں نے
 مجھے ملعون کہا۔ لعنت و ملامت اور دشنام دینے۔

ایک دن جب میں فاتح جو المزد کی طرح خاردار راہوں میں اپنے دھتے
 کے اوپر چلا جا رہا تھا تو صبح کے وقت ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ یکایک میرا
 دھتہ چلتے چلتے رُک گیا۔ اور میرے دل کے پردوں سے نقیوں سے لبریز یہ آواز
 سُنائی دی۔ ”پالیا۔ پالیا۔“

لیکن نہ جانے کس دُکھ درد کے زیر اثر تھا رے لبِ بعلیں کو جنبش ہوئی

اور بولیں : ” پیارے الوداع ! تم میرے نہیں۔ میرا قصہ پردہ خیال کے
دھوڑا لو۔“

اتنے دنوں تک کسی نے میرے چلتے ہوئے رہتے کو روکنے کی ہمت نہیں
کی تھی۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں رہتے کے پیٹے کے نیچے فرط محبت میں کچل گئیں !
لیکن آہ ! آج کیا ہو گیا۔ رہتے کی رفتار ختم کیوں ہو گئی۔ جان ! اس دن تم سنگدل
بن کر صرف مجھے الوداع کہہ کر چلی گئیں۔ مجھ بد نصیب مسافر سے ! ہمیں کرنا گوارا
نہ کیا۔ بتاؤ یہ کہاں کی ریت ہے۔

لیکن تمھاری اس بے رخی سے مجھے دکھ نہیں ہوا۔ اور میں نے متہارے
گلے میں اپنی زندگی کا بیش قیمت ہار ڈال دیا۔ تم سر جھکائے کھڑی رہیں۔ میں
نے تمھاری اس خاموشی کا مطلب نہیں سمجھا۔ دل میں جگے لے اٹھنے لگے ! بد آنکھیں
اشک ریزی کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ نہیں معلوم تمہیں میری اس جرأت بجا سے
خوشی ہوئی یا غم۔ کاش ! میں تمھارے راز کو جان سکتا۔

مکرم تم پر مجھے جتنا بھی فخر ہو اس کے یہ معنی نہیں کہ تم مجھ سے برگشتہ خاطر
ہو جاتیں۔ میں نے تو تمھارے راز نہ جان کر ہی محبت کی ہے۔ اور اپنی
جان تمنا سمجھ کر ہی گلے میں ہار ڈال دیا۔ میرے دل کے اندر کانٹے کی جوش
پوشیدہ تھی جس کی تلاش میں مسافر بن کر مارا مارا پھرتا تھا اگر اسے ڈھونڈ
نکالا تو بتاؤ میں نے کیا گناہ کیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم شکست خوردہ باغی کو کہا

سے ہنس کر ہار ڈولوانے کی بجائے پاؤں سے ٹھکرا چلی جاؤ گی۔ لیکن مہتاری
 اس کج روی کا جرم بھارے سر نہیں ڈال سکتا۔ میں جانتا ہوں جان! اچھی طرح
 کہ کسی انسان کا دل دوسرے کا سہارا لینا نہیں چاہتا۔ وہ جس سے محبت
 کرنے کی تمنا دل میں رکھتا ہے دل اس کو نہیں پہچانتا۔ دل! اپنے محبوب
 کی خاطر تڑپ تڑپ کر جان دے سکتا ہے لیکن اسے دوسرے سے محبت
 نہیں ہو سکتی۔ کتنی مدت سے میں مہتیں حاصل کرنے کے لئے بھکاری بن کر
 سطح گیتی کا گشت لگا رہا ہوں۔ لیکن ساری کوششیں نقش پر آب ہو جاتی
 ہیں۔ آہ! آج تم بھی میری گرفت میں نہیں آ سکتیں۔ نہ جانے کب کس
 جہنم میں اور کس نامعلوم دنیا میں اپنا گھر پاؤں گا۔

کل رات میں مہتارے خط کو پڑھتا رہا۔ بار بار پڑھا۔ لیکن آہ! اس کے
 اندر مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ تاکہ میرا باطل خیال اور کھوٹلا یقین بدل جاتا۔ میرے
 دکھ درد نے دل میں ہزاروں نیکیوں کا چھوڑ دئے۔ کتنی برجھیاں پیوست کیں
 لیکن شمع حیات اب تک فروزاں ہے۔ مہتار خط پڑھ کر میری ہلکی سی
 گئیں۔ بالکل اسی طرح جیسے شبنم کے قطرے سے گدا اس بھیگ جاتی ہے۔
 میں نے خط کو نہ جانے کتنی بار پڑھا۔ نہ گزرا۔ یہ الفاظ کہیں نظر نہ آئے مجھے
 تم سے محبت ہے۔ تاہم اتنے دنوں تک اپنے ارادے کو مستحکم رکھ کر اور
 اپنی خودی کو بلند کر کے مہتیں خط لکھتا رہا۔ آج ارادے کی وہی استقامت

اور خودی کی وہی سرفرازی میرے جگر میں پیہم غلش کا گھاؤ عنایت کر رہی ہے۔ مگر واہ رے محبت کی جولانیاں کہ تم سے مفارقت پسند نہیں۔ اسی لئے آج لمحہ بن کر یہ کہتے ہوئے اپنی زندگی کو موت کی بھینٹ چڑھانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں محبت جیسی چیز بالکل غنقا ہے۔ محبت کر کے محبت کو نہ پانا ایک محبت کے وجود کی یہی دلیل ہے۔ جو ان گونا گوں مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد لمحہ بن جاتا ہے وہی اس حقیقت کو جانتا ہے۔ محبوبہ کی دی ہوئی دکھ کی نشانیاں محبوب کے لئے سکھ کا تحفہ ہیں۔ لیکن دل کو ہزاروں مشکلات میں اسیر کر کے محبت کو حاصل نہ کرنا۔ کیا یہی راہ حقیقت ہے۔

مرد ازل سے عورت کے دل کو فتح نہیں کر سکا۔ عورت کا باطنی راز سمجھنا بہت دشوار ہے، بہت کٹھن ہے۔ عورت سب دے سکتی ہے لیکن دل کا سر بستہ راز اور پوشیدہ نشانیاں آشکارا نہیں کر سکتی۔ میں نے سنا ہے کہ عورت کو دل دینا جہنم کے لپکتے ہوئے شعلوں میں اپنی ہستی خاکستر کر دینے کے مترادف ہے۔ لیکن جان! مجھے تمھارے اوپر اتنا فخر کیوں ہے، جانتی ہو؟ صرف اس لئے کہ تم نے میری سخت سے سخت جھڑپ برداشت کی ہیں۔ اور تمھاری تیوری پر بل نہ آیا۔ کبھی میں نے تمھارے نازک کنول جیسے ہونٹ میں شیریں تبسم کی بجائے زہر ہلاہل نہیں دیکھا۔ اور نہ میں یہ جان سکا کہ مہتیں مجھ سے محبت ہے یا نفرت! ان باتوں کو

سوچ کر میرا سینہ پھٹا جاتا ہے۔ میں بلتی ہوں جان! کہ تم اپنے خطوط میں میرے ان تلخ الفاظ کا ذکر نہ کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ تم انھیں بالکل پوشیدہ رکھو گی۔ اگر میں نے جیل کی سنگین سلاخوں سے نجات حاصل کر لی تو ایک بار پھر دل سے بغاوت کر کے مہتیں پانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ اُف! کس کے ساتھ میں نے سلسلہ کلام آغاز کیا۔ کون سنگدل اور گونگا دیوتا میرے دکھ کی راگنی سُن رہا ہے۔

جانتی ہو سکتی کیوں نہیں ہو سکا۔ صرف اس لئے کہ میں عام انسانوں کی مانند مجازی محبت کے بندھن میں جکڑنا نہیں چاہتا۔ میری آنکھیں روزانہ مشاہدہ کرتی ہیں کہ مرد و عورت کے ساتھ بڑے خلوص و محبت سے پیش آتا ہے۔ کبھی نوک جھونک ہوتی ہے، پھر وہی پیار۔ اسی طرح ان کی زندگی کی منزلیں طے ہوتی رہتی ہیں۔ شادیاں ہوتی ہیں۔ بچے پیدا ہوتے ہیں اور پھر یہی بچے سن بلوغیت کو پہنچ کر رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ بھوکھ میں آتی ہے۔ عیش و عشرت کی ترنگیں پھوٹتی ہیں۔ لیکن وہ بیچارہ اس راز سے بیخبر ہے۔ اور شاید جاننے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا کہ جس کے ساتھ اس نے اتنے دنوں تک رنگ رلیاں منائی ہیں۔ اس کے دل کا حکمراں نہ بن سکا۔ جسم تو گوشت پوست کا ایک لوتھر ہے۔ اس پر قابض ہونا کہاں کی دانش مندی ہے۔ اس راز کو میں نے جس دن سے سمجھا ہے میں کسی کے

ساتھ پیمانِ محبت باندھنے سے ہمیشہ کنارہ کشی کرتا ہوں۔ مبادا کہ وہ میرے زانو پر سر رکھ کر اور میری شریکِ حیات بن کر دوسروں کی محبت میں بیکل ہو وہ اپنی غم گزیدہ زندگی کو سکھی بنانے کے لئے دوسروں کے ساتھ سلسلہ محبت قائم کرے۔ ان باتوں کو سوچ سوچ کر دل کا زخم اور ہرا ہو جاتا ہے اس لئے میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اسی کے ساتھ اپنا گرباؤں گا جس کے دل کی پہنائیوں میں میری محبت کی جلوہ پاشیاں ہوں گی۔

بتاؤ جانِ تمنا! میرے ساتھ اتنی سنگدلی کیا معنی رکھتی ہے۔ میں نے اپنی اس پیہم خلش سے یہ معلوم کیا ہے کہ جب بمختاری محبت میری دُکھی زندگی کے لئے بار آور نہ ہوگی۔ اور جب عالمِ یاس و سرِ اِیگی میں دُنیا سے کنارہ کش ہونا چاہوگی۔ اسی دن میرا تصورِ تمہارے لئے وجہ سکون ہوگا۔ اور اس بات کو یاد کر کے سینہ کو بی کر دوگی کہ اس دُنیا میں ایک بدنصیب تھا جس نے تم سے محبت کی بھیک مانگی تھی۔ اور تم نے دینے سے انکار کر دیا۔ چشمِ آزد و! بادِ کرو، وہ بدنصیب انسان تمہیں پا کر سر کا تاج بناتا بھقیں دل کی ملکہ بناتا اسے تمہاری محبت پر فخر تھا۔ اس کی موہوم امیدیں تم سے وابستہ تھیں۔ تمہیں نہیں چاہئے تھا کہ اس کی سُنہری امید کو توڑ کر جدائی اختیار کر لیتیں۔ بمختاری اس دامنِ کشی نے اس کی نشاطِ انگیز رانگیوں کو آنسوؤں کی لڑیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ بھی سن لو کہ اس کے بقیہ

دل کو کہیں قرار نہیں مل سکتا۔ ہمیشہ کی طرح ہاتھوں میں اشکوں کا ہار لیکر اپنی بیکل زندگی کا بوجھل پہیہ گھسیٹتا مارا مارا پھر گیا۔ اس کی آغوش تمھارے لئے ہر وقت کشادہ رہے گی۔ اس نے تم سے اپنی حقیقی محبت کا اعتراف کر کے دانستہ اپنی گردن پر تلوار ماری ہے۔ وہ دن بھی یاد کرو جب تم نے اس کو اپنی ترانہ نواز صداؤں اور اپنے شبِ ماہ کے طرہ ہائے گل سے جدا کر دیا تھا۔ لیکن اس نے تمھاری ساتھ کیسا سلوک کیا۔ اس کے لبوں پر صرف بانسری کا درد انگیز راگ پھوٹتا رہا۔ اور ملک میں ساون بھادوں کا منظر پیش کرتی رہیں۔

دورانِ تحریر میں اور ایک بات میرے ذہن میں آگئی۔ اُسے بھی سناتا ہوں۔ کل تمھارا خط پڑھتے پڑھتے یکایک احساس ہوا۔ آہند کوئی دوسرا تمھارے ساتھ محبت کی پینگیں کیوں بڑھائے۔ اُسے کیا حق ہے کہ تمھاری غزالی آنکھوں اور شیریں لبوں سے کھیلے۔ ان باتوں کو سوچ سوچ کر میرے دل کے اندر جیسے شمشیر لوٹنے لگتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم صرف میری بن کر رہو۔ صرف میری۔ اور میں تمھارے حسن و جمال کی پرستش کروں۔ جب میں دیکھتا تھا کہ دوسرے بیوقوف تمھاری مینا بدوش آنکھوں کو گھورتے ہیں اس وقت میرا دل چاہتا تھا کہ ان کے دیدوں میں چنگاریاں ڈال دوں۔ لیکن آہ تمھارے خیال بھیت افزا سے میں مجبور محض ہو کر

رہ جاتا۔ اس کے بعد بہت دنوں تک یہ خیال دل و دماغ میں پروش
 پاتا رہا کہ تمہیں جھگ کی گھنی آغوش میں بھگا لے جاؤں جہاں صرف تم ہوگی
 اور میں۔ جہاں ہم دونوں دنیا کی بلا خیز ہنگامہ آرائیوں اور قدرت کی سرد
 مہریوں سے دور ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں۔ کتنی بار میں خودی کو
 تیاگ کر تمہاری محبوب پلکوں کی جھاروں میں آیا تاکہ ایک بار بھی اپنی شہابی
 ہونٹوں سے میری محبت کا اقرار کر لیتیں۔ لیکن آہ! تم برابر میرے سامنے
 خاموش رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دل کا پھوٹا مزید غلش پہنچاتا رہتا ہے کاش
 میں تمہارا باطنی راز جان لیتا۔ تو زندگی کی مضحک گھڑیاں سرد و مفتوح بن جاتیں
 جس وقت تمہاری ننھی انگلیوں میں میرا خونچکاں لفافہ پہنچے گا۔ اس
 وقت میں تمہارے خوش رنگ اور بیتاب پہلو سے بہت دور جیل کی آہنی
 سلاخوں میں بند ہوں گا۔ مرد دنیا کی احمق ترین مخلوق ہے۔ وہ عورت کی
 محبت کو فتح کرنے کے لئے اپنی خودی تک سچ دیتا ہے۔ وہ اس کے طلسمی
 حسن اور معصوم و سست ناک نگاہوں کے سحر انگیز دام میں اس طرح اسیر
 ہو جاتا ہے کہ اپنی شان و عظمت تک کی پروا نہیں کرتا۔ وہ عورت کی نازک
 انگلیوں سے کھینے کے لئے، اس کی نورانی صباحت سے اپنی تشنگی دور
 کرنے کے لئے بیٹل قیمت گھڑیاں برباد کر دیتا ہے۔ لیکن تم عورتوں کے
 دل کے اندر کیا راز سر بستہ ہے، وہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ وہ کنگال محبت

کا بھوکا انسان صرف تمھارے بلوریں رخساروں کا لمس چاہتا ہے۔
لیکن آہ! تم نے اس بد نصیب انسان کی محبت کا جواب دینے سے گریز کیا
میں اسی لاناہل معنی میں پہروں ابھارتا ہوں۔ لیکن حل کی کوئی صورت
نظر نہیں آتی۔

محققین نہیں معلوم کہ عورت کو مرد کی شریک زندگی بنایا گیا ہے۔
اس کا فرض ہے مرد کی اطاعت کرنی۔ اس کے دکھ سکھ میں کام آنا۔ اگر تم
نے خدمت کرنی، دکھ سکھ میں کام آنا اپنا معمول بنالیا تو تم دیوی بن سکتی ہو
اس دکھی کے دکھ کو سمجھ کر ہر قسم کا تیاگ قبول کر سکتی ہو۔ لیکن تمھارا یہ کہنا
کہ محققین بھوں سے محبت ہے بالکل جھوٹ ہے۔ یہیں تو مرد و ابلہ مسخری
کا شکار بن جاتا ہے۔ اگر تم نے مرد کی اطاعت اور محبت کرنی شروع کی تو وہ
تمھاری نشاط زندگی میں اضافہ کر دے گا۔ لیکن کتنی نادان ہو یم کہ محققین اسی
سے محبت ہوتی ہے جس کو تم سے محبت نہیں۔ اور تم اسے اپنے دل کی مسند
پر راجہ بنا کر بٹھانا چاہتی ہو۔ بناؤ کیا یہ کبھی ممکن ہو سکتا ہے۔

اور تم سے زیادہ تو احمق ہے وہ انسان جو تمھارے ظاہری حسن اور
ناز واداکا اسیر بن کر تم سے محبت کی بھیک مانگتا ہے۔ لیکن اس اندھے اور
بد بخت انسان کو کیا معلوم کہ جس روپ میں اس کو محبت کی جلوہ پاشیاں
نظر آتی ہیں اس میں زہریلی تلخیاں بھی شامل ہیں۔ ایک نہ ایک دن اسے

انجام کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کیونکہ مجازی محبت کی حلاوتیں دیر پا نہیں ہوتیں شاید یقین اس حسن پرست انسان کی کہانی یاد نہیں جسے ایک شباب کی امنگوں میں بدمست عورت نے نصف شب کو اپنے تپتے ہوئے پہلو سے نکال پھینکا تھا۔ آہ! ان باتوں کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس بھول میں پڑ کر تو ہزاروں روحیں آسمانی فضا میں پرواز کر گئیں۔ اور کتنی زندگیاں کانٹوں میں الجھ کر رہ گئیں۔ مرد ایسی زندگی سے پریشان ہو کر تمام بھول کا شکار اپنے آپ کو بنا لے ہے۔ اور پھر اس کے بعد اس کے دماغ میں خودکشی کرنے کا خیال پرورش پاتا ہے۔

بتاؤ خدا رابا وایا کیوں ہوتا ہے؟ کیوں اپنی زندگی کو برباد اور دوسروں کی زندگی کے تار و پو بکھیرتی ہو۔ دنیا میں ہزاروں ایسی مثالیں ہیں کہ جس شخص نے عورت کو اپنے کعبہ دل کی ملکہ بنا تا چاہا اسی عورت نے مرد کے کلیجے میں چھری بھونک دی۔ اس انجام کار کو پہنچ کر بھی وہ اس کے پاؤں کی ہندی بن کر تعاقب کرتا ہے۔ لیکن یاد رکھو تم نے جس محبت کی تذلیل کرنا اپنا پیشہ بنا لیا ہے آخری دم تک ویسی محبت حاصل نہیں کر سکتیں مہتیں اپنے حسن سے مملو شبیبہ پر ناز ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ مرد تمہاری محبت کا ایک ذرہ ہی پا کر دیوانہ کی مانند ناچنے لگتا ہے۔ ممکن ہے تم میری اس بات کو غلطی پر محمول کر رہی ہو۔ مگر میں اپنے حیرت بات کی بنا پر ایسا کہنے کیلئے مجبور ہوں

اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم یہ کہو کہ "عورت محبت حاصل کرنے کے لئے کنگال بنائی گئی ہے۔ اسے محبت مل گئی تو وہ اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دیگی۔"

مجھے یہ سن کر بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ کیونکہ مدت سے بچپن کی طرح تمہیں اپنے شہ رگ کے قریب رکھا۔ محبت کی راگینوں سے فضا کو مدغم کر دیا۔ لیکن انوس میں تمہیں نہ اپنا سکا۔ لیکن پھر کیوں تمہاری محبت میرے دل کو ہر وقت کریدتی رہتی ہے۔ کیوں فطرت کے ذرہ ذرہ میں تمہاری نورانی صباحت کا انوکاس دعوتِ دید ویتا رہتا ہے۔ آخر ایسا کیوں میری رانی !

آج میں پریسڈنسی جیل کی تیرہ وتار کو ٹھڑی میں تمہیں یاد کر رہا ہوں کل میرے مقدمہ کی پیشی ہونے والی ہے۔ جیل کا ایک افسر میرے بچپن کا دوست ہے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اسکول کی زندگی بسر کی ہے۔ اسی کا کرم ہے کہ مجھے اتنا طویل طویل خط لکھنے کا موقع ملا۔ ورنہ میں اپنی حالت سے شاید ہی کسی کو آگاہ کر سکتا۔

تم خیال کرو گی کہ جیل کی سنگین کو ٹھڑی میں رہ کر اتنی اُداسی کیوں؟ کاش تم جان سکتیں کہ میری یہ اُداسی کس لئے ہے۔ صرف اس لئے کہ اب تم سے آنکھیں چلو نہیں ہوئی۔ مجھے دق ہو گئی ہے۔ دق! جو انسان کی

زندگی کا خاتمہ کرنے کے لئے واحد علاج ہے۔ ڈاکٹر مجھے سخت محنت کرنے سے منع کرتا ہے۔ دوست و احباب مکمل آرام کرنے کی منت سماجت کرتے ہیں۔ کاش میں ایسا کر سکتا۔

میں نے آج تک کسی سے اپنے دل کی مفصل کیفیت بیان نہیں کی لیکن نہ جانے کیوں میں نے اس خط میں دل کے مدفون شعلے پھیلا دیئے ہیں۔ میں اسے تمھاری محبت کا اعجاز کہوں یا کیا۔ میں ملتی ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی قصور ہو گیا ہے تو اسے درگزر کرنے کی کوشش کرو۔

دق نے میرے پھیپھڑے کو گلا دیا ہے۔ اور اس جیل کی مشقتیں مزید گھٹن لگا رہی ہیں۔ ہر وقت دل کی حرکت بند ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ابھی ابھی میرے منہ سے خون کا ایک لوتھڑا گرا ہے۔ لال۔ لال! موت کا خون!

ممکن ہے مہلتیں یہ سن کر دکھ ہو کہ میں اپنی اس زندگی سے بہت اکتا گیا ہوں!

رانی! مجھے مطلق یقین نہیں تھا کہ میری زندگی کا چراغ اتنی جلد ہی گل ہو جائیگا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔

بہر کیف! اب میں تم سے وداع ہو رہا ہوں، ہمیشہ کے لئے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ تمھاری نگاہوں کا کاٹنا اس دُنیا کی پشت سے

سوکھ چکا ہے۔ اس وقت میرے ارد گرد تاریکی ہی تاریکی چھائی ہوئی ہے
خوفناک اندھیرا ہے۔ اُف! میرے معبود !

تمھارا

”شہاب ثاقب“

آپ بیتیاں

آپ بیتیاں

گلستاں!

گلستاں! طویل عرصہ کے بعد تمھاری آغوش میں آیا ہوں۔
 اے میری مادرِ وطن! تمھاری چھائی کتنی سرد ہے، کتنی گداز ہے! آج
 میں یا کل تنہا صحن میں کھڑا ہو کر عہدِ رفتہ کی جگہ پاش باتیں یاد کر رہا ہوں۔
 وہ باتیں جب تم میرے گالوں پر بیٹھے بوسے ثبت کر رہی تھیں۔
 اور زندگی کی دھوپ چھاؤں کی کہانیاں سناتی تھیں۔ آج میرے دل
 کے اندر وہی بیٹی باتیں طوفان بن کر اُمنڈ رہی ہیں۔ اور میرے احساسات

کا چراغ بجھا جاتی ہیں !

وہ ماں آج کہاں ! کہاں ہے میری قدیل احساس !

ماں کی اندھی محبت نے مجھے خدمتِ وطن سے روک دیا تھا۔ لیکن آج اسی ماں کو کھوکھو کر میرے ذہن و فکر میں، ادراک و شعور میں وطن کی محبت جاگ اٹھی ہے۔ ماں ہی نے میرے دل کے اندر محبت کی لُغ بیل ڈالی ہے۔ اسی نے محبت کرنا سکھایا ہے۔ میں ماں کی تحقیر و تذلیل کرنا نہیں چاہتا۔ وہی شاہراہِ حیات کی عظیم ترین رہنما ہے۔ محبت کی دیوی پیار کی اولین شاع ہے۔ اسی نے میرے پردہٴ دل میں نقشِ محبت بٹھایا ہے۔ اسی نے میری آنکھوں میں پیار کی شعاعیں بچھا ور کی ہیں۔ اسی نے مجھے رہ نوروی کا شوق دلایا ہے۔ اور میں آج تک اسی طرح پیش روی کرتا چلا جا رہا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں میں دیوانہ ہوں، پاگل ہوں، مجنوں ہوں۔ کاش ! میں انہیں سمجھا سکتا !

آہ ماں ! تم تو چمن زارِ بہشت میں اقامت گزریں ہو گئیں۔ لیکن میرے پردہٴ دل میں یہ کیسی آتش فشاںیاں سوئپ گئیں۔ میں نے ہمیشہ کہا تھا کہ گناہ کا یہ بوجھل بار کبھی سنبھال نہیں سکوں گا۔ لیکن آہ ! تم نے سُنی ان سُنی کر دی۔ ہنسی میں اڑا دیا۔ جیسے میرے دل کی تمام باتیں تمہیں معلوم تھیں۔ تم جو بدور اکو میری کمزور پشت سے باندھ کر چلی گئیں اسکا

آج ان باتوں کو، اُس عہد پارینہ کی سہانی داستان کو اچھی طرح یاد کر رہا ہوں بدو را! کیونکہ زندگی کی یہ طویل گھڑیاں جو میں نے تمہاری مفارقت میں گزاری ہیں بار بار میرے ویران دل کو کُرید جاتی ہیں۔ فرقت کا ستایا ہوا جب "پیا پیا" کی رٹ لگا کر ماہی بے آب کی طرح تڑپا کر جان دیدیتا ہے اس وقت خوشی کتنی زہریلی اور تلخ ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو تو وہی در ماندہ دہر و فرقت زدہ سمجھ سکتا ہے۔

اُس دن کی بات ہے۔ اسی دن صد چاک دل کے اندر دُکھ کی راگنی بچ اٹھی تھی۔ اور مجھے یاد آ رہا ہے وہ دن جب پھاگن کا آتش آلود پانی آسمان سے گر کر پھل پھول کی زندگی تروتازہ کر رہا تھا۔ اور دودل جوانی کی اُمنگوں میں سرشار نشاطِ عیش کے جھولے میں جھول رہے تھے۔ انگور کے شیریں اور خوبصورت خوشے پرستان کی حسین دوشیزہ کی طرح دعوتِ دیدے رہے تھے۔ ناشپاتی حسینہ کے حجاب آلود سرخ رخساروں کی مانند فروزاں تھی۔ اور بیدانہ کا شیریں رس اس طرح ٹپک رہا تھا جیسے محبوبہ کے تہم آمیز سرخ ہونٹ تھر تھرا رہے ہوں۔ جتن نوزد میں بلبلی پستہ کے پھول کھا رہی تھی۔ درخت کی نازک شاخوں میں کوئل زندگی کا سنہرا گالاپ رہا تھا۔ اور اس کی موسیقی کی جھنکار دلوں کی ترنگوں میں اضافہ کر رہی تھی۔ جنوبی نرم و سرد ہوائیں اپنے دامن میں

خوشبو سیٹ کر میری آغوش میں پھینکتی بھی چلی جا رہی تھیں۔ اور میں بلبل شیراز کے دیوان کے قریب آ کر بھاری سیاہ ہراتی ہوائی لٹوں سے کھیل رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ صرف ہم دو کی آنکھوں سے آنسوؤں کے مقدس قطرے سطح خاک پر موتی کی طرح بکھرتے جا رہے تھے۔

وصل کی یہ اولین گھڑی۔ جہاں خوشیوں کی ترنگیں اور عشتروتوں کی راگیناں بج رہی تھیں ہماری کتاب زندگی کا پہلا ورق الٹ الٹ کچلی گئی تھی۔ اس وقت تمام چیزیں منتشر ہو گئی تھیں۔ جس طرح کسی برہن کی کتاب کے اوراق تیز و تند ہوا کے جھونکے منتشر کرتے چلے جاتے ہیں۔ کیا ان بکھرے ہوئے صفحوں کو بدور کے بغیر میں ترتیب دے سکوں گا۔ آخر کار اپنے تخیل کے اس چین کے اندر تم کو ڈھونڈ ہی نکالا۔ کیونکہ تم صرف میری ہو۔ بدور کیا بھارے دل میں مفارقت کا وہ نقشہ منقوش ہے۔ میں آج شیراز کے بلبل کا وہی نغمہ دوہرا رہا ہوں۔ سنو!

میں نے اس دن چمنستان میں موسم بہار کی صبح دیکھی تھی۔ پدمساکے پھول پر شبنم کے گوہر آبدار کروٹ بدل رہے تھے بھونر دل ہی دل میں سیاہ آنکھوں سے اشک بیزی کر رہا تھا۔ یکایک میں نے نیم شگفتہ کسم کو دیکھا اور کہنے لگا۔

”بھونری تم کس درد و کرب میں مبتلا ہو کر اشک فشاں ہو؟

کیا تمھاری سیاہ آغوش میں تمھاری محبوبہ نہیں ہے ؟

یہ سن کر بھونرے نے ٹوٹے ہوئے الفاظ میں کہا

”ہمے شاعر! یہی تو رونے کا وقت ہے !

کیونکہ اتنے دنوں بعد آج میری تمنا بار آور ہوئی ہے۔

اور وصل کی خوشی میں تمام دکھ کو آنسوؤں کی راہ بہار ہا ہوں۔“

اسی وقت تمھارے ماموں آئے اور بھتیجی میری قربت سے بہت دور

گھسیٹ کر لے گئے۔ بھتیجی میری ایک بات پر بھی یقین نہ آیا۔ صرف نفرت

کی مہنسی سہنس کر انھوں نے مجھ سے اتنا کہا کہ میری طرح خانہ بدوش کے ساتھ بددور کی دوستی نہیں ہو سکتی۔

میرے آنسوؤں کو دیکھ کر انھوں نے پھر کہا : ایران کے پاگل شاعر

کا دیوان پڑھ پڑھ کر تم پاگل ہو گئے ہو۔“ اور پھر میری طرف متہاری التفات کا

اندازہ لگاتے ہوئے بولے : ”تم نے اس پر سحر کر دیا ہے۔“

اس کے بعد طویل گھڑیاں اسی بیکل اور بے چین جھونے کے قریب آوارہ

گردی کرتے گزر گئیں۔ اور جب میری پلکیں وا ہوئیں میں نے دیکھا بہار کی

جانفرازی گینیاں اب تک فضا میں لہرا رہی ہیں۔ لیکن تم نہ بھتیجی۔ صرف تمہارے

پاؤں کی مہندی کا نشان میرے سینے میں داغ بن کر مہر مہر تھا۔ اور رنگین

چوڑیوں کے ٹکڑے ریت کے فزوں میں چمک رہے تھے۔

میں کبھی کبھی پریشان ہو کر نکلیں اس پار پکارتا۔ بدورا۔ اور
میری آواز پہاڑ کا سینہ چیر کر فضائے بسیط میں ٹھکرتی۔ را۔ آ۔
آ۔ !

بلوچستان اور افغانستان کے سارے پہاڑوں اور جنگلوں میں میں
نے ہمیں تلاش کیا۔ لیکن جھرنے کے قریب تمھاری کٹیٹیا نہ پاسکا۔

ایک دن صبح کو میں نے دیکھا کہ ایک پاگل قسم کا انسان آسمان کی طرف
دیکھ کر جست لگا رہا ہے۔ مجھے بہت ہنسی آئی۔ آخر کار میں نے ہنسی ضبط کرتے
ہوئے پوچھا: کیا اس طرح جست لگا کر آسمان میں چھید کرنا چاہتے ہو؟
مگر وہ طیش میں آ کر چند اوٹ پٹاٹنگ اشعار بکتے لگا۔

اور میں نے ذرا سنجیدہ ہو کر کہا: تو تم شاعر بھی ہو؟
اس نے گردن مڑکاتے ہوئے جواب دیا: ہاں کیوں نہیں!
”مگر تمھارے یہ اشعار درست تو نہیں ہوئے!“

”کوئی حرج نہیں“ پھر اس نے میرے گال کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔
”ہوا کے نیلے رنگ کو آسمان سمجھ کر پکڑنے لگا۔ مگر وہ دور مٹ کر کہنے لگا: سنو
میں آسمان نہیں ہوں۔ ہوا ہوں۔ میری ہستی ایک خلا ہے۔ مجھے پکڑ
نہیں سکتے۔ میں نے تم کو پایا ہے۔ اور تم نہ پا کر پکڑنے آئے ہو۔ یہی تو
تمھاری بہت بڑی بھول ہے“

ایک ہی لمحہ میں میری مہنسی دُکھ سے بدل گئی۔ اور میں سوچنے لگا۔
 ہاں ٹھیک تو ہے جس کو میں نے دل کے اندر پالیا ہے اسے باہر پانے کی
 کوشش کیوں — ؟ اور اسی دن میں نے اپنے مکان میں آخری
 آنسو بہا کر کہا ”بدور ! تم میرے ٹوٹے ہوئے دل کے اندر بسی ہوئی ہو
 جہاں خون کے قطرے رواں دواں ہیں !“

اور آج میں طول طویل سفر کے بعد ہندوستان کے گلی کوچوں میں
 اس لئے گھوم رہا ہوں تاکہ تمھاری یاد میں جی بھر کر تڑپتا رہوں۔ لیکن کیا اس
 طرح آوارہ گردی کرتے کرتے زندگی کے پہاڑ جیسے دن کٹ جائیں گے؟
 دیکھو بدور ! ہندوستان کے حس و خاشاک میں گلستاں کی خاک سما گئی ہے
 وہی بار بار مجھے یاد دلا جاتی ہے کہ میری جستجو میں تمھاری سحر آفریں آنکھیں
 قطراتِ اشک سے بھیگی رہتی ہیں۔ ایک دن اس نے یہ بھی بتایا کہ تم جن
 میں آخری بار کھل کر سوکھ گئی ہو۔

لیکن دیکھو وہ کون ہے جو مجھے بیقرار کرنے کے لئے خرمہ کے درخت
 کی اڑ میں چھپ گئی ہے۔ بتاؤ وہاں کس کے آنسوؤں کا جھرنہ پھوٹ رہا
 ہے۔ کیا تم ہو؟ میری روح ! میری قندیل حیات کی
 روشنی — !

کہو تم کہاں ہو بدور !؟ کہاں چلی گئیں آخر؟

بدو راکی کہانی

بوستان !

آسمان کی چھاتی میں دُکھ کی کیسی جھیل بہہ رہی ہے ! شاید اسی بارش کا اثر ہے جو ابھی ابھی سطحِ خاک میں زندگی ڈال چکی ہے ۔ مگر نہیں آسمان روئے گا کیوں ؟ اس کا سینہ دُکھ سے کیوں پھٹے گا ۔ اس کے آنسو میرے ناپاک آنسوؤں کی طرح تو گندے نہیں ہو سکتے ۔ وہ کتنا سرد ہے ۔ کتنا نرم ہے ۔

لیکن کیا میں عالمِ خواب میں گم ہوں — ؟
اُف ! یہ کس کی کرب انگیز آواز ہے جو ہوا کا جگر چیر کر بال کشا ہے
یہی آواز تو میری تمناؤں کے خرمن میں حشر خیز ہے ۔

وہ پھر واپس آجائیں گے ۔ یہ تو قرینِ قیاس ہے ۔ مگر اتنے دنوں بعد کیوں ؟ — اتنی تبدیلی کیوں ؟ — سامنے کسم کی احمریں نازک کلیاں خون آلود نظر آرہی ہیں ۔ اور ہوا میں دُکھ کی آواز مرنے لگی ہو کر بھی جا رہی ہے — وہ آئیں گے ! میں اپنی دیران گُٹیا کیسے آراستہ کروں — اگر آنا تھا تو دو دن قبل کیوں نہیں آئے — اسی دن — جب میں نے تمہیں آغوشِ چمن میں دیکھا تھا ۔ کاش اسی روز میں تمہارے گلے میں باہنیں

ڈال کر کہتی :

”نہ جاؤ جانِ حیات !“

لیکن ہم عورت ہیں۔ گریہ و زاری اور نالہ و شیون کے سوا اور کیا کر سکتی ہیں۔ لیکن مرد — اس کا سینہ تو سنگریزوں سے دبا ہوا ہے۔ جب وہ کسی عورت کو نوحہ و ماتم کناں دیکھتا ہے تو کہتا ہے : ”یہ بھی کوئی ہے کمزور، بُزدل !“

کئی سال قبل جب میں نے بھئی دیکھا تھا — کس طرح آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ اور تم ”بدورا“ کہہ کر کھجور کے درخت کے چھپے چھپ گئے تھے۔ یہ ساری باتیں آج میرے تختہ نشین کو پریشان کر رہی ہیں — چند ثانیہ کی دلدوز ملاقات اور پھر مفارقت کی المناک گھڑی۔ لیکن آہ ! آج تک پھر میرے پاس تم نہیں آئے۔ نہ جانے کیوں ؟

میرے دل و دماغ میں یہ کیسا تضاد برپا ہے۔ کیا میری زندگی ہمیشہ کیچڑ میں لت پت رہے گی۔ سچ ہے چاند کا کلنک پور نمائی کی روشنی کے دن ٹھہر نہیں سکتا۔ مگر اُف ! گناہ کا یہ احساس کتنا تلخ اور تکلیف دہ ہے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ہزار ہا سوئیاں میری چماتی میں چُنبہ رہی ہیں — !

اور یہ پاجی اور ذلیل ”خواجہ“ سیف الملک کی باتیں — اسکی

یاد کیوں نہیں ختم ہو جاتی۔ اگر وہ ابھی میرے سامنے آجائے تو میں اُسے اپنے پنجے سے نوچ ڈالوں۔ اس کی بوٹی بوٹی چبا ڈالوں !

میں عورت ہوں۔ اور میری اس گناہ آلود زندگی کا انجام کیا ہوگا ! اسی کو سوچ سوچ کر رنج و غم کی بھیلانگ تصویریں میرا گلا دبانے کے لئے پیش قدمی کرتی چلی آتی ہیں۔ لیکن مرد کبھی اپنے گناہوں سے پشیمان نہیں ہوتا۔ اور نہ اپنا مستقبل دیکھ کر آلام و مصائب کے دیکھتے ہوئے انکارے میں گرنا چاہتا ہے۔

اُس دن جب میری خواہش پوری ہو چکی تھی۔ نہ جانے کیا یک کس طرح سیفِ اسلک کو نظروں کے قریب دیکھا۔ اس کے چہرے میں جیسے لاج اور شرم کی سیاہی بھری گئی تھی۔ اور وہ دونوں ہاتھوں کو آسمان کی جانب اٹھا کر یہ کہہ رہا تھا۔ اے رب العالمین ! میری ناپاک زندگی کو ختم کر کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دے۔ یا نہیں تو میرے تاریک دل کے اندر اپنی حقیقی روشنی کی عکاسی کر۔“

پھر اس نے مجھے ترحم آمیز نگاہوں سے بغور دیکھنے کے بعد پیرولہ پر گر کر گڑ گڑاتے ہوئے کہا۔ ”تم اس شیطان کو معاف کر دو۔ اگر معاف کر دیا تو میری زندگی روشن ہو جائیگی۔ تم کیا ہو۔ کیسے کہوں۔ لیکن میں۔۔۔ اُف، اُف، اُف ! اُس کے بعد اس نے ایک لمبی سانس لی۔

لیکن یہ کیا؟ میرے دل کے اندر یہ بقیاریاں کیوں؟ دماغ
 میں کوہ آتش کیوں پھٹ پڑا ہے۔ کیا وہ اس کھجور کے درخت کے نیچے
 عالم ہیوشتی میں پڑے ہوئے ہیں۔ نہیں نہیں، اب میرا دل دھوکا نہیں
 کھا سکتا۔ لیکن کاش ایک بار پھر ملاقات ہو جائے۔ صرف ایک بار! او
 میں کہوں گی۔ ”جانبِ حیات! اب یہ بد درِ امتحاری نہیں رہی۔ وہ تو
 مرحبہ کی۔ اس کا دل امتحان سے دل سے ہمیشہ کیلئے پیوست ہو چکا ہے۔
 سنو! اب اس کی تلاشِ لاحاصل میں اس طرح صحرا نوروی ترک کر دو۔
 وہ نہیں ہے۔ نہیں، نہیں!!“

اس کے بعد بھی۔ اگر وہ مجھے تلاش کریں گے تو میں ان سے کیا
 کہوں گی۔ کیا کہوں گی؟ ہاں ٹھیک ہے میں ان سے یہی کہوں گی۔
 ”مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ میرے ناپاک جسم کو چھو کر اپنے پاک جسم کی تذلیل نہ
 کرو!“

آہ! پیارے! کتنا دکھ ہے۔ کون ہے جو میرے شکستہ دل کو
 چھری کی تیز دھار سے پارہ پارہ کر رہا ہے!“

دارا کی کہانی

گلستاں!

تم کیا دہی گلستاں ہو؟ لیکن تم میں آج اتنی اداسی کیوں۔ کہاں گئی حسین اور دلآویز پھولوں کی وہ خوشبو؟ ان سے توجہم کی سڑی ہوئی لاشوں کی بواٹھ رہی ہے۔ تمہارے صاف و شفاف آسمان کی وہ روشنی کہاں گئی۔ نہ جانے اس کے ذرے ذرے میں گند پانی کس نے چھوڑ دیا تمہاری ہواؤں میں جیسے اُن گنت گھائل انسانوں کی آہیں جمع ہو گئیں۔

اور تمہارے جسم میں درد کی تیز چھری چل رہی ہے۔ آہ بدور! تم نے کیا کر دیا۔ کیوں تم نے میرے دل کی ساری آسائشیں چھین لیں؟ کیا اس کے اندر بھی کوئی راز مضمر ہے؟ لیکن دل اس بہلاوے میں کیوں آنے لگا۔ نہ جانے قندیل احساس کیوں روشن ہو جاتی ہے۔ کوئی مجھے بتاؤ کہ جب ایک پیاسا ”پانی پانی“ اچلائے ہوئے بادل کے قریب پہنچ جاتا ہے اور بادل تلخ ہنسی بہنس کر اس کی چھاتی چھید ڈالتا ہے تو اس کے احساس میں یہ باتیں کیوں جاگ اٹھتی ہیں؟ — کہ بادل بہت کٹھور ہے۔ ظالم ہے۔ بے رحم ہے۔

مگر آج ملک میں اپنا روپ سمجھ نہیں سکا۔ پہلے سوچا کرتا تھا۔ میں اتنا بلند ہوں، میرے خیالات کتنے اونچے ہیں۔ میری ہستی میں کتنی زندگیاں رقص کرتی ہیں۔ لیکن آہ! میں آج اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تمام انسانوں سے محبت کرنے کے باوجود بھی میں عظیم الشان

نہیں ہوا ہوں۔ میرا دل بھی اس کے دل کی طرح اتنا ہی تھخ ہے تو پھر
میں نے بدور کے گناہوں کو معاف کیوں نہیں کر دیا۔ کیا یہی میری سب
سے بڑی خطا ہے؟ ظاہری حُسن و خوبصورتی کی تباہی کے بعد بھی اس نے
اندرونی حُسن میں عفو نہت اور گندگی کی کھھاڑی مار کر ظاہری حُسن کو گوناگوں
خوبصورتیوں سے دلاؤیز بنا لیا۔ یہی ہماری سب سے بڑی بھول
ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ بدور کے اندرونی مقدس حُسن کو نہ دیکھ کر
میں معاف نہیں کر سکا۔ مجھ جیسا مجرم اور گنہ گار کیا اور کوئی بھی ہو سکتا
ہے۔

آہ! میں کتنا ذلیل اور حقیر ہوں۔ بہت روز قبل بدور کی
زبانی یہ لفظ سن کر میں جہنم کے تیرہ و تار یک عذاب میں گر گیا تھا۔ اور میں نے
یہ خیال کیا تھا کہ اس طرح شکست کا مذموم ہار پہن کر بدور کو فتح کروں گا
نہ جانے پھر کس کے زبردست ہاتھوں نے سہارا دیکر اور میرے لرزتے
ہوئے آنسوؤں کو پونچھ کر جہنم کے شعلہ بداماں دروازے سے گھسیٹ
لیا۔ پھر یہ صدا میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "یہ انتقام بدور سے کیوں
مجرم تو خدوتم ہو۔" یہ صدا سن کر میں پھر زندگی کی خاردار آغوش میں
گر گیا۔

اس کے بعد ایک دن میرا نے بدور سے اتنا کہا: اگر دل نے

محقق کسی دن درگزر کرنا چاہا تو شاید ایک بار پھر ملاقات ہو۔ ورنہ یہ ہماری جدائی ہے۔“ کچھ دیر سکوت کے بعد میں نے بلند آواز سے یہ بھی کہہ دیا۔ ”محقق پا کر تو میں نے ”باطل“ کو خوش آمدید کہا ہے۔“ اور بدور اٹھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ ”واپس جانا ہی پڑیگا پیارے! تمھارے دل کے پردے پر جو شبہات میرے خلاف مرتب ہو گئے ہیں دیکھو! کچھ دنوں میں دور ہو جائیں گے۔ شاید اسی دن معلوم ہو جائیگا کہ میری محبت کی زنجیر نے تمہارے دل کو کس مضبوطی سے جکڑ لیا ہے۔ میں تمہاری طرف دیکھتے ہوئے گلستاں کے اس حسین جھرنے کی دھاری میں بیٹھ کر گیت گاؤں گی اور مالانگوندھوں گی تاکہ ایک نہ ایک دن تمھارے نگے میں ڈال سکوں۔“

محبت کی پرستش بیکار نہیں جاتی جان تمنا!

سیف الملک کی کہانی

میں وہی شیطان ہوں۔ وہی گنہگار جس نے ایک مقدس عورت پر بے شمار مظالم توڑے۔ کیوں نہ اب میں اپنی اس مکروہ زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ اس کے بعد؟ اس کے بعد میرا بھی وہی حشر ہوگا جساو گنہگاروں کا ہوا کرتا ہے۔

گنہ گار کو اگر سزا ملے تو اس کے لئے اس میں سکون ہے۔ کیونکہ یہ بے انصافی نہیں ہے۔ لیکن اگر سزا نہ دی جائے تو اندرونی خلقت اور غیض و غضب میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا۔

میں جو سوچتا ہوں وہ نہیں ہوتا۔ اور وہی ہو جاتا ہے جسے نہیں سوچتا۔ آوارہ گردی کرتے کرتے آخر میں آزاد سپاہی کی جماعت میں آ گیا۔ تمام سپاہی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ لیکن جب میں نے اپنی رام کہانی سنائی تو انھیں بہت دکھ ہوا۔ اور اسی دوران میں میں نے بھی ان کی داستانیں سنیں۔ مظلوم اور دکھی انسانوں کی داستانیں۔ سپاہیوں کی بتائیں، جو فوج میں اس لئے شامل ہو گئے ہیں کہ انھیں پیٹ کی بھوک مٹانی ہے۔ ان کی ولد و زکھانیاں سن کر مجھے یک گونہ اطمینان ہوا۔ کیونکہ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ روشنی کی یہ پہلی جھلک تھی۔

کئی روز بعد میں نے اس جماعت میں دارا کو بھی دیکھا۔ بد نصیب دارا۔ اور جب میں نے اس جماعت میں شمولیت کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا۔ اس سے عمدہ کام میرے لئے اور کیا ہو سکتا تھا بھائی !

آلام و مصائب کی سڑیں سہتے سہتے وہ کتنا ادا اس ہو گیا ہے۔

اس کا وہ شگفتہ چہرہ، اس کی وہ متین ہنسی، یہ ساری باتیں کہاں گئیں! اب اس کی شکل کتنی زرد ہو گئی ہے۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں۔ اور ہنسی تو گویا بالکل معدوم ہو گئی ہے۔ میں تو وہ بد بخت اور ناہنجار ہوں جس نے دارا کو اس اندوہناک منزل پر پہنچایا ہے۔ میں نے ہی تو اس کے دل میں آگ بھڑکائی ہے۔ میری ہی وجہ سے تو اس کے ارمان خاک آلود ہو گئے ہیں۔

سبھوں کو اس بات پر تعجب ہے کہ دارا کس قوت کے زیر اثر جنگ میں شریک ہوا ہے۔ اور اتنی محنت و مشقت کے باوجود بھی اس کے چہرے پر ہنسی کی سرخیاں کیوں دوڑتی ہیں۔ شاید وہ بتانا چاہتا ہے کہ اب وہ دن دور گیا جب دارا بھکاری کی زندگی گزار رہا تھا۔ جب وہ دوسروں کی نگاہوں میں حقیر اور ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ اب دل کی بڑھتی ہوئی پیاس کو جنگ کے خون سے بجھانے کے لئے موت کی طرح کھڑا اور بیرحم بن کر دوسروں کی زندگیاں قربان کر رہا ہے۔ جب بھی اس کی تشنگی کھولتے ہوئے پانی کی مانند اُبل پڑتی ہے وہ انسانی خون سے اپنی پیاس دور کرتا ہے۔

میں نے دارا کی اس تبدیلی پر گھنٹوں غور کیا ہے اور غور کرنے کے بعد یہی نتیجہ نکالا ہے کہ اس کی یہ جنگ، اس کی یہ خونخواری ظاہری

مرد کے لئے نہیں بلکہ وہ اندرونی دُکھ کے ناقابلِ برداشت حوالے سے
مجبور ہو کر حیوانیت کی راہ پر گامزن ہو گیا ہے۔

آج وہ تمام سپاہیوں کا سردار ہے۔ تاہم اس کی بڑی
بڑی آنکھوں میں دُکھ کے آبشار کیوں پھوٹتے ہیں؟ روزانہ زخم پر زخم
کھاتا ہے۔ مگر ہسپتال میں وہ کون ہے جس کے تکین آمیز الفاظ
اسے پھر جنگ کے لئے کمر بستہ کر دیتے ہیں۔ خون میں غرق ہو کر انسان
کو موت کی بھینٹ چڑھانا اس کے لئے کتنی مسرت کا مقام ہے۔
وہ خود کہتا ہے۔ ”وہ انسان جو دوسروں کے لئے بارگراں ہے، اس
کی کمی ہی تو میرے لئے خوشی کا باعث ہے۔“

میں یہ سن کر انگشت بدنداں ہو جاتا ہوں کہ آخر یہ پاگل نہیں تو
کیا ہے۔

’اُف یہ کیا ہوا؟ بد قسمت اور بد بخت دارا کی بینائی ختم ہو چکی کان
بہرے ہو گئے۔ مجھے اس کا اندیشہ تھا کہ اس کی تشنگی کا پھل یہی ہوگا
نہ جانے اس کی بصارت و سماعت کے چھن جانے میں کونسا از سر بستہ
ہے۔ اس خطرناک کھیل میں کس کا ہاتھ کام کر رہا ہے!

مجھ پانی اور گھنگار کو سزا کیوں نہیں دی گئی۔ مجھے کیوں نہیں

اندھا اور بہرا کر دیا گیا۔ پہلے ہی سے وہ بے سہارا ہو رہا تھا۔ اب اس میں تاب کہاں کہ مزید ٹھوکریں کھاتا پھرے۔ آج ہم لوگ اپنے اپنے وطن کو سدھار رہے ہیں۔ کیونکہ جنگ کی ہولناکیاں دم توڑ چکی ہیں۔ اور فتح کی راگنی تمام سپاہیوں کے دلوں کو برما رہی ہے۔ لیکن جب اندھا بدنصیب دار امیرے شانے کا سہارا لیکر سپاہیوں کے سامنے کھڑا ہوا ایک ایک تمام سپاہی ایک ساتھ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اور جب سب کے آنسو ختم گئے تو سبھوں نے یکے بعد دیگرے کہنا شروع کیا۔ ”دارا! تمھاری شجاعت تمام انعامات سے افضل و برتر ہے۔ ہم تمھیں کوئی انعام نہیں دے سکتے۔“

”تم نے بن بلائے جنگ میں شرکت کی۔ اپنا دکھ سکھ بھول گئے بندوق کی گولیاں تمھاری رگوں میں سنسنائیں، لیکن تم ایک حرف بھی زبان پر نہیں لائے۔ یہی تمھاری شجاعت کا بلند ترین کارنامہ ہے یہی بہترین تحفہ ہے۔ اس جنگ کا معاوضہ تمھیں مل گیا ہے یعنی تمھاری بصارت ختم ہو گئی۔“

اور دارا نے آہستہ آہستہ دھیمی آواز میں جواب دیا: ”الوداع عزیز بھائیو! الوداع!“

میں دارا کو لیکر گلستان میں چلا آیا۔ اب میں اسی کے ساتھ رہتا

ہوں۔ کیونکہ اس نے میری خطا درگزر کر دی ہے۔ میں نے ایک دن دُعا سے پوچھا :

”تم نے بدو را کو معاف کر دیا دوست ؟“

میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے اس نے یہ غزل سنائی :-

”اے میری محبوبہ ! تم نے مجھے جتنا دکھ اور درد دیا ہے

میں نے ان کے مجموعہ سے مقدس محبت کی مسجد کی بنیاد رکھی ہے“

جس طرح اس روئے زمین پر بچہ کی طرح اور کوئی معصوم نہیں ، بالکل اسی طرح دار ابھی محبت پا کر بچہ کی طرح معصوم ہو گیا ہے۔ اس کی شکل میں ہنسی کی کتنی مقدس یکیریں کھنچی ہوئی ہیں۔ کتنی شیریں اور لعن پرور آواز ہے اس کی۔ اس کے آنسو کتنے پاک و شفاف ہیں۔

میں نے دریافت کیا ڈارا ! کیا تم نے آنکھیں اور کان کھوکھلا کر حاصل کی ہے ؟“

اس نے جواباً کہا : ”ہاں میں نے جو اس خمسہ کے دو بہترین اوصاف کھو کر سکون جاوید پایا ہے۔ اس وقت میں کیا دیکھ رہا ہوں ، جلتے ہو ؟ ہاں میں دیکھ رہا ہوں کہ میری بدو را کی نگریز ہنسی روشنی بن کر میری رہنمائی کر رہی ہے۔ اس کی چوڑیوں کی جھنکار اور اس کی تقدس مآب موسیقی مجھے

بتا رہی ہے کہ میری بصارت و سماعت دونوں موجود ہیں۔“

پھر اس نے گانا شروع کیا :

”اگر تم نے اور کسی سے محبت کا آغاز کیا ہے۔

اگر تم واپس نہیں آ سکتیں۔

تو تم للہ اسی کے ساتھ رہو، میرے دکھ کی پروا نہ کرو!

لیکن تمہارے دل کے کسی گوشہ میں اگر میری محبت جاگزیں ہے

تو سنو!

تمہارے سوا اس دنیا میں میرا اور کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔“

وہ آرا کی یہ دُکھ بھری راگنی فضائے بسیط میں بہت دیر تک طاری

رہی۔ آہ! اس راگ میں کتنا درد، کتنا دُکھ اور کتنی تھر تھراہٹ تھی۔

بدور کی کہانی

گستاں!

شاید انھوں نے مجھے دل سے معاف کر دیا ہے۔ یہ تو معلوم

ہی تھا کہ وہ مجھے ایک نہ ایک دن معاف کر دیں گے۔ اور شاید یہی وجہ ہے

کہ میری آج کی شام سکون کے ساتھ گزر گئی۔ اب میں دن بھر ان کیلئے

آرزوؤں کا ہار گوندھتی ہوں۔ اور اس کے معاوضہ میں انھوں نے مجھے جو

تحفہ دیا ہے وہ ہے "تحفہ ورد"۔

ایک دن انھوں نے کہا تھا "بدور! خواہش اور محبت یہ دو مختلف اوصاف ہیں۔ خواہش عارضی جوش ہے۔ اور محبت دائمی تھپڑ ہے جو بہتا رہتا ہے۔ اس کو دنیا کی کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ خواہش کے آغاز اور انجام کا سیاہ داغ اگر محبت پر پردہ نہ ڈال دے تو سمجھ لو وہی حقیقی محبت ہے۔ محبت کے وہ مجروح شیدائی جو اس حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں یہ ان کی سب سے بڑی بھول ہے۔ اور ان کی طرح دنیا میں بد نفسی شاید ہی اور کوئی ہوگا۔ روز روشن میں سیاہ بادل سورج پر پردہ ڈالنے کی جتنی بھی کوشش کرے کامیاب نہ ہوگا۔ صرف اس کی تیز روشنی میں کمی آجائیگی۔ کیونکہ سورج سیاہ بادل سے بہت دور رہتا ہے۔ کس طرح وہ اتنے سیاہ بادلوں کا مقابلہ کر کے اپنی شعاعیں سطح گیتی پر منتشر کرتا ہے یا بادل کا تخیل کام نہیں کر سکتا۔ اور ہم بھی سوچنے سے قاصر ہیں۔ اس کے بعد بادلوں کے چھٹ جانے سے شعاعیں اوز نکھر جاتی ہیں۔ سورج جس طرح روز ازل سے مشرق سے مغرب تک مصروف جاہد پیمانی ہے اسی طرح تاقیامت ربکا۔ تو کیا چادر آسمان پر بادل کا کارواں نہیں آئیگا۔ وہ بھی ہمیشہ اپنا کام انجام دیگا۔ اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔ خواہش بھی ٹھیک اسی بادل کی مانند ہے۔ اور محبت دل و دماغ میں شعاع خورشید کی طرح روشن ہے۔

اور ہمیشہ روشن رہے گی۔

خواہش ہی نے تو بھٹارے ظاہری حسن کو برباد کر دیا ہے۔ لیکن باطن کو تباہ نہیں کر سکی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید تم مجھے شناخت نہ کر سکتیں۔ باہر کی ہوا محبت کے چسپاں کو بجھا نہیں سکتی۔ بلکہ روشنی کی شعاعیں اور منعکس ہو جاتی ہیں۔ لیکن میری بینائی اور قوت سماعت! میں ان کے کھو جانے سے نہیں روتا بدوراً!

ٹھیک اسی وقت ایک بلب کرب آمیز آواز میں سیب کے درخت سے ”پیا پیا“ کہہ کر پرواز کر گئی۔

انہوں نے پھر کہا: ”دیکھو بدوراً آج ہم لوگوں کی آخری دید ہوگی! اس کے بعد طلوع آفتاب کے ساتھ ساتھ تم جھرنیکے اس پار چلی جاؤ گی۔ اور میں اس مفارقت کی آگ میں جلتا رہوں گا۔ اس دو پار میں رہ کر ہم دونوں جدائی کے گیت گائیں گے۔ اور ایک دوسرے کو تڑپائیں گے۔ اور اس تڑپ کے اندر ہمیں دائمی سکون ملے گا۔“

اس دن سے میں جھرنیکے اس پار ہوں۔

جب ان کی شیریں آواز کی دلدوز گنی اس پار کانپتے کانپتے آتی ہے تو میری آنکھوں کے آنسو جھرنیکا طرح امنڈ آتے ہیں۔ ان کا راک ہے۔
”ہم دونوں دکھ کی قندیل روشن کر کے

ایک دوسرے کو مدعو کریں گے
 کیونکہ ہمارے دکھ کی پوجا ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔“

شعلے اور پھول

شعلے اور کچھول

صحارا ریگستان کے نزدیک -

افریقہ !

پردہ خواب چاک ہوا۔ لیکن خواب کی تاریکی اب تک باقی ہے
میری رات صبح میں بدل گئی۔ ہر طرف آفتاب کی سیہیں شعاعیں صفحہ گیتی
پر منتشر ہو گئیں۔۔۔ ساتھ ہی میری چھاتی تخیل خواب سے باہر نکل آئی۔
لیکن اس کا دائی نقہور جو میرے ذہن کے پردہ پر سربستہ ہے،
کیا اس کی کوئی منزل نہیں؟ کیا یہ غیر فانی ہے۔۔۔ نہیں، نہیں ہیگ

کی تپتی ہوئی چھاتی سے جو جھرتا پھوٹ رہا ہے۔ ٹھیک اس سراب صحرا کی مانند عکسِ رُخ یا رُخ کی شگفتہ یاد ہی نے تو میرے خالی دل میں ایک صاف و شفاف چہنمہ بہار رکھا ہے۔ آہ! میں نے اپنی کمزور چھاتی کے اندر مختار تصور کس طرح محفوظ رکھا ہے بھئی کیا معلوم۔ مگر اے چہنمہ تجنیل تم بہے جاؤ اسی طرح تا ابد اپنی روانی جاری رکھو۔

آفتابِ صبح کی اولین شعاع تمام اُتاروں کے دلوں میں خوشی و مسرت کی راگیناں الاپتی ہے۔ نیلگوں آسمانِ رُخ روشن سے نقاب ہٹا کر کسی نقشِ پاکی تلاش میں دھیرے دھیرے چلا جاتا ہے۔ اور وہ انجم اپنے راگوں کی مالا رکھ کر بادلوں کی آڑ میں سُنہروں کا محل تیار کرنے لگتے ہیں۔ مگر آہ! میری صبح نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب میرے پاس قوتِ برداشت نہیں کہ خورشید کی افشائیاں سہہ سکوں۔ دیکھو میری آنکھیں ہنگامہ اضطراب سے چھلک پڑنے کو ہیں۔ یہ میری کونسی صبح ہے جہاں صرف شبِ سیاہ کی بدبختی اور غمناک سانسیں بکھری ہوئی ہیں۔

خوف کی آنکھیں وا ہو گئیں، جنگل اور بیابان میں معارفت کی آگ لگ گئی۔ میں صدائے بازگشت کرتی ہوئی مُردہ موسیقی کو دفن کر آیا۔ سبز دختوں کی شاخوں میں پھولوں کی کلیاں پھوٹنے لگیں

بیل کی میٹھی راگینوں کے ساتھ معطر ہوائیں لہرا کر آئیں یسٹیا ماکا
گیت نغمہ انگیز کشش کے ساتھ ہوا کا دادر لیکر رقص کرتے کرتے آیا۔
کوئل اور پیپے سجھوں نے مل کر راگنی کی ابتدا کی۔

”سن میری جان حیات ! اے جان حیات !!

کونسا تحفہ کروں میں پیش تیرے واسطے !“

ایک نا آشنا آواز بھیر دیں سروں میں میرے روبرو لہرانے
لگی۔ ”جاگو مشرقی باشندے“ اور پھر میری خفتہ آنکھوں کو بیدار کرنے
کے لئے یہ نغمہ فضا میں باز گشت ہونے لگا۔ !

”تم حسین ہو میری دُنیا کے لئے وجہ نشاط“

مگر میں اسی طرح اُداس پڑا رہا۔ گوناگوں بحر تخیلات کی موجیں اب
میرے سر طحار ہی تھیں۔ اور آنکھوں سے گوہر آبدار رخساروں میں
سیماب کی مانند تھر تھرا رہے تھے۔ آسمان کے جو قطرے شبنم بن کر گھاس
میں مل گئے ہیں کیا صبح کو ان کی خبر مل سکتی ہے۔ اسے کیا معلوم کہ ملکہ
شب کس درد و غم سے مجبور ہو کر اشک ریزیاں کرنے پر مجبور ہوئی ہے۔
اور کیوں پھر اپنے غمناک کلیجہ میں پتھر رکھ کر ماتم کا نقاب الٹ دیتی ہے۔
زنجیر شب پاش پاش ہونے کے بعد یہ آواز فضا ئے بسیط میں
پھیل گئی۔ ”بھور ہوارے“ اور ہواؤں کے دامن میں مل کر پوری

کائنات میں پھیل گئی۔ اٹھو، کام کرو! ” مگر آہ میرے خواب کی زنجیر
 ٹوٹتی ہوئی نظر نہ آئی۔ بدستور آنسوؤں کے قطرے رواں دواں تھے۔
 گھر کے تمام دروازے کھل گئے۔ لیکن یہ مقفل دروازہ کس طرح
 کھلے گا؟ اور اچھا ہے نہ کھلے۔ کیونکہ میرے کلیجہ میں ایسے تیر و نشتر
 چھبے ہیں جنہیں صرف برٹیش ہبی کی چھانی تیرداشت کر سکتی ہے۔ دوستو
 اس ناکام تمنا کو اس طرح اندھیری کٹیا میں مقفل رہنے دو۔ نہ جگاؤ اسے
 اگر راہ میں جلتے جاتے کبھی تمہیں دکھ اور مصیبت سے دوچار ہونا
 پڑے تو کم از کم میرے لئے ایک آہ بھر لینا۔

آج میں سبھوں سے چھپا کر یہ کہانی قلم بند کر رہا ہوں یہ نہیں معلوم
 کیوں؟ لیکن ہاں اتنا سمجھتا ہوں کہ میری اس المناک کہانی کے اندر
 محبت کی بجائے نفرت ہے۔ اور ساتھ ہی اپنے الفاظ میں برت آلود
 پہاڑ کی طرح جو پردہ ڈال رہا ہوں جانتے ہو یہ کیا ہے۔ یہ غم ہے خوشی
 نہیں۔

میں آج تمام لوگوں کی نگاہوں میں عجیب بنا ہوا ہوں۔ یہ بھی
 کیسا معتمہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ تازہیت اسی طرح اتانوں کی
 شیطنت پر وزنظروں سے دور بہت دور چھپ کر رہوں۔ میں اپنے

آلام و مصائب کو پتھر کی چٹانوں سے مسل کر اور اس کے چاروں طرف
دھندلی کہر کا جال بن کر چھپا دوں گا۔ دل کی گوناگوں ستم رانیاں نغمہ
ہائے فردوس کی لہروں میں بہہ جائیں گی۔ یہ دیکھ کر ابلہ فریب انسان
مسکرائیں گے۔ اور ترش رو ہو کر کہیں گے۔ ”چھی، سپاہی کی زندگی بھی
کتنی کمزور ہوتی ہے۔“

ابھی سے میرے دل و دماغ شرم و حجاب کے افکار سے پھٹے
جا رہے ہیں۔ اگر میں اس چھوٹی ٹکیا کے اندر رہ کر کبر آلود چھاؤں میں
چھپا رہوں تو شاید ازلی دُکھ سے نجات پا جاؤں گا۔ لوگ میری اس
تہنائی کی خبر نہ پا کر اور مجھے بھول کر مزید ہدفِ لعنت نہ بنائیں گے۔
راکھ بن جائیں میرے یہ خیالات! مجھے کیا پڑی ہے کہ اپنی زندگی
کو تہنائی کی گھناؤنی تاریکی میں سمیٹ لوں۔ میں یہ سب کس لئے تحریر
کر رہا ہوں؟ انسان اپنے دُکھ کی تسکین چاہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو
اس کی پُر آلام زندگی بہت کٹھن ہو جائے۔ کہ مفرادِ دوست کے سامنے
زندگی کی غم آلود اور روح فرسا کہانی سنا کر۔ کچھ اس کی زبان سے
تسکین آمیز الفاظ سن کر ہی تو دل کا بار ہلکا ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو
کیا کوشش کرنے کے بعد بھی دُکھ کا دہکتا ہوا آتش فشاں اور لپکتی ہوئی
چنگاریاں سرد ہو سکتی ہیں۔ کیا پہاڑ کی بھاری بھر کم چٹانوں سے دُکھ

کے انگارے دبائے جاسکتے ہیں؟ کیا کبھی ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ انسان
تادم واپسین دکھ کی گھنگھور گھٹاؤں میں زندہ رہ سکا — کبھی نہیں۔
اگر ہم اپنے دکھ کو ان چٹانوں سے پھپھادیں تو کیا پہاڑ کی چھاتی کے پتھر
جو ایک دوسرے سے ٹکرا کر چنگاریاں برساتے ہیں ہم روک سکیں گے۔
لیکن یہ احساس ہوتا ہے کہ شراب کا دھواں آگ کی چھاتی
میں گر جانے سے قبل کس طرح ساکن ہو جاتا ہے۔ کس طرح بارش
کی پھوار کے بعد فطرت اطمینان کی سانس لیتی ہے۔ ریگ کے ذرات
سراب بن کر کس طرح تشنہ لب انسانوں کو مبتلائے فریب کرتے
ہیں لیکن وہ اسی طرح اٹل اور ساکن رہتا ہے۔ اگر تم سکون حاصل کرنا
چاہتے ہو تو پہاڑ بن جاؤ، پہاڑ کی چٹان بن جاؤ۔ وہیں شانتی ہے،
وہیں سکون کی راگیناں بھراتی ہیں۔ آہ! وہی ہم انسانوں سے
بہتر ہے۔

میں ظاہری طور پر سنگدل اور کٹھور ہوں — لیکن باطن میں
ریگ کے شعلہ پرورد ذرے کی طرح میرے سینہ میں آگ کی بارش
ہوتی ہے۔ کیا اس آگ کی تپش سے آنکھوں کی راہ بخار بن کر
قطرہائے اشک پھلک نہیں آتے۔ نہیں دوست! انکار اور مذاق
کا خوف میرے لئے بہت ہیبت ناک ہے۔ مجھے اس سے بہت ڈر

گھٹتا ہے۔ اسی لئے میں اپنے باطن کے درد اور دکھ کو شرم و حجاب کی لڑائیوں میں پرونا نہیں چاہتا۔ اگر ہوا تو وہ مقدس تحیل کی تذلیل ہی کر لے گا۔ مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ یکایک میری اس مایوس زندگی کو تمناؤں کی موجیں ٹکرائے گیں۔ سکون اور خواب میری نگاہوں میں ڈورے ڈالنے لگا۔ اسی سکون کو حاصل کرنے کے لئے میں یہ تحریر کر رہا ہوں۔ اسی عالم چناں میں کھو کر سفید کاغذات کو دل کے سارے آلام و تفکرات سے سیاہ کرتے پرتلا ہوا ہوں۔ میں ان اوراق میں صرف دوزندگیوں کی تصویریں پیش کروں گا۔ ایک دکھ کی ازلی کہانیاں اور دوسری اشکبار نغمے کی لڑیاں۔ اور شاید میرا یہ عمل تادم واپس جاری رہے گا۔

میرا یہ فخر آج دنیوی مصوّر پر نہیں بلکہ اے میرے مالک میری ساری بلندیاں صرف تجھ پر ہیں۔ تو نے ہی میرے دونوں ہاتھوں کو خالی اور تنگ کر دیا ہے۔ تو نے ہی میرے سارے سہارے کو میرے گھبراہ کو ہوا کے شدید جھونکوں میں اڑا دیا۔ میری تمنائیں راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔ میری محبت کو نفرت سے بدل دیا گیا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے عزم میں اتنا ہی اٹل ہو گیا ہوں جیسے پہاڑ کی بلندو بالا چوٹیاں !

میں نے خوفناک اور عظیم الشان سمندر کو چھوٹے جہاب کی طرح اپنا سر اٹھایا ہے۔ ہنہیں معلوم کب اور کس طرح ایک پلک کے اندر میری کمزور چھاتی کی تمام امیدیں اور آلام و مصائب کا کمرہ آتش فشاں اس جہاب کی مانند کہاں ختم ہو جائے۔ اُف! کوئی ہنہیں کہہ سکتا۔ اور کوئی ہنہیں روک سکتا۔ موت کا ادنیٰ اتھیل ہی میرے لئے دائمی سکون ہے!

جب میدان جنگ میں انسانوں کی زندگیاں آگ اور گولوں بموں اور مشین گنوں کا شکار ہو رہی ہوں گی۔ جب لال لال خون کی دھاریں تشنہ زمین کی پیاس بجھائیں گی اس وقت مجھے ظاہر ہیں ظالم اور سنگدل بننا پڑے گا۔ ہیبت ناک دیو کی مانند ڈربن کر اپنی تشنہ لبی کو اس خون کی چھینٹوں سے بجھانی ہوگی۔ میں سیاہ انسان ہوں۔ ان سفید فام انسانوں کا حکم ماننا میرے لئے کس قدر مشکل بات ہے۔ اسی لئے تو میں سپاہیوں کی نظروں میں عزت سے دیکھا جاتا ہوں۔ میری پلکوں میں کبھی قطرہائے اشک امنڈ کر بُزدلی کا نشان ہنہیں دکھاتے۔

جب شعلہ پرور آنکھوں میں خوشی کے چستے پھوٹتے ہیں یکا یک بجلی کی شعلہ فشاںیاں میرے دکھی دل کے اندر خنجر پیوست کر دیتی ہیں۔

لیکن میں اپنے سرمدی غنوں کی روانی میں مدغم ہو کر نوکِ شمشیر کی ضربیں فراموش کر دیتا ہوں۔ میرے ظاہر و باطن میں ایسا سیاہ پردہ آدینا ہے کہ میری محبوبہ حقیقت کو کوئی بہرہ راز کوشش بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ایک ایسی گہری تاریکی اور کُہر چھایا ہوا ہے کہ انسان کی دوربین نگاہیں ہاں تک پہنچنے میں ناکام رہ جاتی ہیں۔

خداوند! میری اس مسرت و شادمانی میں جو ہمیشہ سے ایک پردہ حائل ہے کیا وہ کبھی ہٹ نہیں سکتا بلکہ کیوں میری اس دعا کا جواب ملتا ہے: "ہاں ہاں اسی طرح رہنے دو!" مگر آہ جس کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے، جس کی آنکھیں کنگال ہیں۔ جس کی موت پر اشک ریزی کرنے والا کوئی نہیں۔ جسے خدا کی رحمت کی حاجت نہیں۔ وہ صرف آنسو کے ایک قطرہ کا خواستگار ہے۔ ایسا قطرہ جس کے اندر لازوال محبت روپوش ہو۔ لیکن اس سب کے باوجود بھی میرے تخیلات کے اندر صرف تیرہ و تاریک یا خورشید صبح کی شفا شعاعیں کیوں بیکل کرتی رہتی ہیں۔

وہ رات آج ہی کی طرح چاندنی رات تھی۔ ہواؤں کے دامن میں زعفرانی خوشبو کی دل افروز لہریں شامل تھیں۔ میرے دل میں

بھولی ہوئی کہانی کا ایک ہلکا سا عکس نظر آیا۔ جس میں اس کی حسین جمیل شکل دکھائی دی۔ جیسے وہ دودھ میں نہائی ہوئی ہو۔ باغ میں مختلف الوان کے گلہا نے شگفتہ دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ دماغ خوشبو کی شفات لہروں میں بہا جا رہا تھا۔ ملکہِ مشب کے پھول اپنی بھینی بھینی خوشبو میں مگن چاند کی صوفشاں کرونوں میں لہرا رہے تھے۔

دیکھو وہ گلہائے رنگا رنگ میں آراستہ نشاط و عیش کی بانسری چھیڑتی آرہی ہے۔ اس کی سیاہ کافرلٹیں اور ساری کے آسپل دوش فضا پر لہرا رہے ہیں۔ آسمانی جگنو و امنِ شب تار میں گوشیاں کر رہے ہیں۔ یکا یک شیریں راگیناں کہیں سے بہہ کر آئیں۔ "دلنواز اٹھو۔ دیکھو خواب کے دیس سے ایک پری آئی ہے" یہ سن کر جیسے آسمانی جگنوؤں نے ایک ہتھکڑی لگایا۔ ہوائیں عشرت کے ترانے لپٹنے لگیں۔ مجھے خوف معلوم ہوا جیسے جسم کے ایک ایک روتھیں میں کیچی پیدا ہوئی۔ پھر مجھے احساس ہوا۔ یہ کس خواب کے دیس کی حسین و جمیل دو شیرہ ہے۔ جو میری گم شدہ جانِ حیات کا روپ چھین کر میری آنکھوں میں خواب کا جال بٹن رہی ہے۔ میں نے خوفزدہ ہو کر آنکھوں کو ملٹے ہوئے دیکھا۔ وہ میرے سامنے بید مجنوں کی طرح کانپ رہی

مٹی۔ پھر س نے جنے کا قصد کیا۔ اور میں نے پوچھا : ”تم کون ہو؟“

سرٹیں نگاہوں سے دیکھ کر وہ رُک گئی۔ تاروں کے عکس جیل میں میں نے دیکھا۔ اس کی دو بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی ریاں ہیں۔۔۔ اس کے لب ہلتے نظر آئے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن فوٹ گویائی پر وہ حجاب میں روپوش ہے۔ سامنے درخت کی نازک شاخیں ہواؤں میں کانپ رہی ہیں۔ اور تارے بادلوں کی آڑ میں چمک زنی کر رہے ہیں۔ پدما کے پھول کی کنواری کلیاں کبھی کبھی موج ہو اسے جاگ اٹھتی ہیں۔ اور تاروں کو دیکھ کر نگاہیں نیچی کر لیتی ہیں۔ اس نے زحمنی ہرنی کی طرح کانپتے ہوئے کہا : ”تم یہاں کب آئے؟“

میں نے کہا : ”آج ہی آیا ہوں۔ تم اچھی ہونا پری!“
ایک درد انگیز سہنس سہنس کر بولی : ”جی! میں اور میرے مکان کے تمام لوگ یہاں آئے ہیں۔ بھائی جان نے اس بارغ کونئے انداز سے آراستہ کیا ہے۔ وہ دیکھو تالاب کے ساحل میں سب لوگ کہانی سن رہے ہیں۔“

میرا نشہ جیسے ختم ہو گیا۔ میں نے فوراً اٹھتے ہوئے کہا : ”آج

دو سال بعد ملاقات ہوئی ہے۔ تم کچھ بدلی سی معلوم ہو رہی ہو۔
کیا بیمار تھیں؟

اس نے اپنے درد دکھ کو آنکھوں کی راہ بہاتے ہوئے کہا۔
”نہیں“ نہ جانے پھر اس کے دل میں کونسی دہی ہوئی باتیں یاد آئیں
کہ رقت انگیز آوازیں بول اٹھی تھیں یہاں کیوں؟ میں جانتی ہوں؟
ایک ہی لمحہ کے اندر آسمان کی دودھ جیسی چھانی سیاہی میں تبدیل
ہو گئی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ ایک دہے ہوئے دکھ کی ضرب شدید
سے میرا کلیجہ چیلنی ہو گیا۔ اور نہ جانے کس عالم بیہوشی میں میرا سر چپکرا
دیوار سے جا لگا۔ اور بائیں آنکھ سے خون کا سرخ سرخ دھارا بہنے لگا۔
میری اس حالت کو دیکھ کر پریمی نے فوراً اپنے آپ نچل کے ٹھٹھے کر کے
میرے زخم میں پٹی باندھ دی۔ میں ان باتوں سے لاعلم تھا۔ جب
میں نے آنکھیں ملنا چاہا تو دیکھا کہ پریمی زخم میں پانی کے قطرے ٹپک رہی
ہے۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے کے لئے بیتاب ہونے
لگے۔ میری سخت فوراً چور چور ہو گئی۔ اور میں نے نرم آوازیں کہا۔
”پریمی! بہت بھول ہو گئی مجھ سے معاف کر دو“

دیر تک خاموش رہنے کے بعد نہ جانے اس نے آہستہ آہستہ
کیا بڑبڑایا۔ اور پھر رخصت ہونے کی تیاری کرنے لگی۔ یہ دیکھ کر مجھ سے

نہ رہا گیا۔ اور میں نے کہا: ”تو کیا تم جا رہی ہو؟“

”اشکبار آنکھوں سے وہ بولی: ہاں!“

لیکن شبِ روشن کی چاندنی کی مانند اس کی آغوش سُن سی ہو گئی اور پتھر کی چٹان کی طرح وہیں کھڑی رہی۔ جب میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ دیکھا کہ موسمِ سرما کے سرد آلود شبنم کے قطرے کی مانند اس کی دو نیم باز آنکھوں میں آنسو جھللا رہے ہیں۔ مجھ میں اب تاب نہ بھتی کہ ان دلدور مناظر کو اور دیکھوں اس لئے واپس چلا آیا۔ میری پلکیں جیسے کسی ناگہانی حادثے سے کپکپا رہی تھیں۔ خیال ہوا کہ یہ چاندنی رات آرام و مصائب کی بھیر ویں سُنا رہی ہے۔ اور پتھر کا جگر کانپ رہا ہے اور وہ۔ میری جانِ حیاتِ شبنم فشاں آنکھوں سے تارے بھرے آسمان کو دیکھ رہی ہے۔ آہ! آسمان ہی کی مانند میری چھاتی میں شعلہ انگیز تارے جل رہے ہیں۔ اور چنگاریوں کے بیچ میری ہنسی جیسا آہ و بکا میں ڈوبی ہوئی چل رہی ہے۔ اور کبھی کبھی بجلی کے نظر افروز شعلے کی طرح بھبک اٹھتی ہے۔

اس دن میرے دل میں یکایک یہ خیال آ کر نشتر چھبوتے لگا۔ کہ میں کتنا ستم رسیدہ ہوں۔ جسے میں نے مدتِ دراز کے بعد حاصل کیا۔

تھا۔ اسے اپنے سینے سے چٹا کر کیوں نہ رکھ سکا۔

آہ! میں بے خبر ہستی محو خواب ہوں۔ اور کیا اس خواب نوشین سے کبھی بیدار بھی ہو سکوں گا۔ دیکھو، دیکھو میرے سامنے ان آنسوؤں کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔ جو جدائی کے وقت پیش کئے گئے تھے۔ جس کی پاکیزگی کو درشا ہوا رکھی حاصل نہیں کر سکتے۔ کاش میں ان آنسوؤں کو جو جدائی کے وقت اس کے بنفشی رخساروں سے مس ہو کر گر رہے تھے اپنے لبوں سے خشک کر سکتا۔ ان ہونٹوں کے ملکوئی تھنے اور پرکشش راگینیاں ہمیشہ میرے کان میں بجتی رہیں گی۔ لیکن آہ اس سے محبت کر کے بھی اسے حاصل نہ کر سکا۔ تو پھر اس نے میرے ساتھ اتنی سنگدلی کیوں کی۔ میری محبت کی ناستدری کیوں کی۔

میں اس کے ساتھ محبت کرتا آیا تھا۔ دل کی نماز خواہشوں اور تمنائوں کو تیاگ کر۔ خواہشات کی دُنیا سے میں بہت پرے تھا۔ پہلے بھی مجھے احساس ہوتا تھا آج بھی ہو رہا ہے کہ اس کو نہ پاکر میری زندگی مضلل ہو گئی۔ لیکن دل پر ہاتھ رکھ کر میں نے تو کبھی اس بات کی کوشش نہ کی کہ خواہشیں مٹانے کے لئے اسے حاصل کروں۔ جس دن میرے دل کے اندر نفس پرستی کا غلبہ ہوا تھا اسی دن نہ جانے کس غیبی ہاتھ نے مجھے روک لیا۔ اور میں شرم و حجاب کے دامن میں محبوب ہو گیا تھا۔ کیا بیری

یہ حقیقی محبت دہی دن میں فنا ہو سکتی ہے۔ !

جب محبت دو دلوں کو ایک نامعلوم کشش سے جکڑ دیتی ہے، تو اسے محبت نہیں کہا جاسکتا۔ یہ تو طبع اور خواہش ہے۔ حقیقتاً خواہش انجام کار میں محبت کو بدل سکتی ہے اگر وہ دور دور رہے۔ مگر یہی محبت پل بھر کے وصل سے کتنی نفرت انگیز اور مکروہ بن جاتی ہے۔ محبت کا وصل تو اتنا آسان نہیں اس لئے یہ سوچ کر کہ میری زندگی بھی ہمیشہ دکھ کے کانٹے میں گزرے گی میں نے ان اچھوٹے لب ہائے مر جاں میں سم قاتل جذبہ نہیں کیا۔ میں اس روضہ بر اندام دوشیزہ کو اپنی مرتضیٰ انگلیوں سے پھیر نہ سکا، اگرچہ مجھے زندگی کا دکھ اور پسند ار حسن کا کانٹا نصیب ہوا۔ پھر بھی میں بھول کر یہ نہیں سوچتا کہ اس طرح بے شرم بن کر اندھے پتھر کی وصل نے میری جان حیات کی توہین کی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس طرح اسے پاسکتا ہوں۔ اس طرح حاصل کرنا عام انسانوں سے بالکل مختلف ہے مجھے یقین ہے کہ آج جسے دکھ اور درد خیال کر رہا ہوں میری زندگی میں وہ دکھ ایک دن ٹھہر بار درخت کی طرح لہلہا اٹھیں گے۔ مجھے اس سے دوامی محبت ہے۔ یہ کہہ کر میں نے دامن کشی کر لی۔ مگر آہ! میرے اس اشارے کو نہ سمجھ کر اس نے کس طرح انکار کر دیا۔ میں تمہارے حسن جہاں تاب سے قطع تعلق کر کے آلام و مصائب کے کتنے عمیق خلیج میں

عزق ہو گیا ہوں۔ اسے تم نہ سمجھ سکو گی۔ پری ! نہیں ، ان تکلیفوں سے زیادہ تکلیف تو اس بات کی ہے کہ تم میرے گھاؤ کے ناسور دیکھ نہ سکیں میں نے محققین جتنا ڈکھ دیا اس احساس سے میری آنکھیں کس طرح اشکبار رہتی ہیں۔ دل میں رہ رہ کر کس طرح کوہ آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے۔ اگر محققین یہ معلوم ہوتا تو شاید اس دن میری روح کو بھولی ہوئی باتیں یاد دلا کر پریشان نہ کرتیں۔

جان تمنا ! مجھے معلوم ہے تم اس دن آؤ گی۔ جب میری زندگی کی تمام تر رنگینیاں اور تنناؤں کی دھندلی شعاعیں کہراؤد فضاؤں میں دم توڑ دیں گی۔ تم دل ہی دل میں سوچو گی۔ اس دن نہیں کوئی سمجھانے والا نہیں رہے گا۔ مگر آہ چشم آرزو ! میں تمہارے آنسو دیکھ سکوں گا۔ اور محسوس کر سکوں گا کہ تمہارے دل سے میری یاد محو نہیں ہوئی۔

دیکھو میرے سامنے رائفیل کی گولیاں بکھری ہوئی ہیں۔ یہ خواب کی تاریکی کے ہزاروں اقسام کے خواب کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ کسی کا تعلق کسی سے نہیں۔ میں ان گولیوں کو مضبوط ڈور میں گوندھ رہا ہوں۔ اور جانتی ہو میری یہ تحریر بھی ان ہی گولیوں کے بار کی مانند ہے۔

پھر مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ہجوم جذبات سے بیتاب ہو کر عالم نہکت و تعطر میں اس کے ساتھ اس طرح سلسلہ گفتگو کا آغاز کرنا مجھے زیب

ہنیں دیتا۔ کیونکہ اس نے ضرور اپنی جودت و ذہانت کی وجہ سے سمجھا ہوگا کہ میں اپنے باطل ضمیر کو مرکز شاع کے اندر رکھ کر اس کے سامنے نخوت کی قربانی پیش کرنے گیا تھا۔ اور شاید جب اس کے دل کے اندر یہ بات آئی ہوگی تو نفرت کے خوف سے اس کے جسم میں رعشہ پڑ گیا ہوگا۔ جب بھی میری طرح بدنصیب انسان میرے مجرد دل میں رحم و کرم کے الفاظ کی پٹی باندھتا ہے تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ میرے ساتھ مہنسی کر رہا ہے۔ مگر یہ تو میرا قصور ہے۔

خواب کی تاریکی اب تک میری آنکھوں سے نہیں گئی۔ آہ! دل کتنا نازک شیشہ ہے کہ اس کے اندر قوت برداشت کا مادہ ہی نہیں۔
میرے دل کے اندر عجیب یقین کی چٹان بیٹھ گئی ہے کہ اسے مجھ سے زیادہ محبت ہے مجھ اس دن جو اس نے میری تذلیل کی اور رشتہ محبت کاٹ کر چلتی بنی۔ آہ وہ ایک ایسا دکھ ہے جو ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت وہ کس طرح سنگین سے کھیل رہی تھی۔ وہ منظر بھلایا نہیں جاتا۔ جب تم انجیئر الفاظ کہنے کے قبل اس کی آنکھیں آہستہ کی طرح اپنی چھاتی کے تمام کھوکھلوں کو آسنوؤں کی راہ بہا رہی تھیں۔ ساری باتیں باطل ہو سکتی ہیں۔ لیکن۔ یہ اتنی بڑی حقیقت تو باطل نہیں ہو سکتی۔ اے بے بصر انسان! اگر تو نے اس وقت اس کا باطنی دکھ دیکھ لیا ہوتا۔ اگر تجھے اس کا وہ سینہ جہاں کوہ

آتش فشاں پھٹا ہوا تھا اور لاوے کی سُرخ ندیاں بہہ رہی تھیں،
 نظر آ جاتا تو شاید تجھے یہ باطل دُکھ اذیت نہیں پہنچا سکتا۔ اگر وہ اس قدر
 سربلندی اختیار نہ کرتی تو عام کنواریوں کی مانند ضرور برق سوزا لہ
 کی ایک تڑپ بن کر تیرے پاؤں پر گر جاتی اور چچ چچ کر کہتی: دیوتا بہت
 اچھا کیا تم نے لیکن اس بدنصیب کو شعلے کی آغ میں نہ گھیٹو۔ اگر اتنا ہی
 کرم دکھانا ہے تو میرے قریب نہ آؤ۔“

ایک دن کی بات ہے۔۔۔ پری اپنی تیسری منزل کے برآمدے میں
 نصف شب کو، نیم خوابی کے عالم میں دُکھ کا یہ راگ الاپ رہی تھی۔
 غرق ہے خوابِ محبت میں ابھی
 دیکھ، دیکھ آئی بہا رِ جانفزا

صدائے طاؤس کے ساتھ سیاہ بادل کی آواز سُنانی ہو رہی
 تھی۔ جھم، جھم، . . . ازنی رقص و سرود میں ڈوبی ہوئی صبحِ صبر
 معمول بے حس بن کر غروب ہو گئی۔ اسی لمحہ جانکنی میں مجھے محسوس ہوا
 کہ میں نے اپنی جان تمنا کو گم کر دیا ہے۔ نہیں نہیں، میں نے تو اُسے
 بہزار دقت حاصل کیا ہے۔ آج میری شبِ وصل کبھی ختم نہ ہوگی۔ رات
 کی آخری بھکی اور صبح کا رُخ روشن میرے گھر سے باہر طلوع و غروب ہوگا۔

کھیاں پھول بنیں گی۔ اور پھول ہوا کے دامن میں اپنی خوشبو پھیلائیں گے۔ میری سکون پرور کٹیا میں وہ درد نغمہ

راگ کانوں کے اندر باز گشت کرتا رہا اور احساس ہوا کہ شاید دو تین دن بعد اس کے شہر میں لگے کی دھکی ہوئی آواز نہیں سن سکوں گا۔ اور مجھے بیس سال کی تباہ تمنا "کو گم کر دینا ہو گا۔"

لیکن آہ! دم واپس اسی کی کچلی ہوئی موسیقی میرے دل کی بانسری میں جھنکار پیدا کرتی رہے گی۔ تین دن کے اندر مجھے اس سے اپنے دل کے تمام پوشیدہ راز کہہ دینا ہونگے۔ اس کے بعد میرے سینے میں اس کا خیال، اس کی یاد اور ہماری رومانی راتیں جہنم کی چنگاریاں بن کر جھلساتی رہیں گی۔ وہ کہیں دور دور از اقامت گزریں ہو جائیگی اور میں بھی کسی سخت خوردہ دسیں میں اپنی راہ لوں گا۔ اس کے بعد ہم دونوں کے درمیان ناقابل عبور خلیج حاصل ہو جائے گی۔

ان تمام باتوں کو سوچ سوچ کر میں برسات کی رم جھم آوازوں میں مل کر راگ الا اپنے لگاؤ۔

"جان تمنا! آؤ ہم دونوں مل کر پیاسے ابا بیل کی طرح بارش کی چھوڑ میں سکون کے ساتھ سو جائیں۔ ہمیں چاند کا امرت نہیں چاہئے۔ ہم چکور تو نہیں ہیں۔ ہم ابا بیل ہیں۔ ہمیں صرف برسات کی دھارا نہیں

چاہئیں۔ بھاگن کا مہینہ ہے۔ بادل کی لہریں ہواؤں سے کھیل رہی ہیں۔ ہم بھی اپنی طرح ایک دوسرے کو یاد کر کے رخصت ہو جائیں گے۔ جان تمنا! تم بھی اسی طرح نصف شب کو بسنت کی بارش بن کر اپنی دھکی آغوش کو میرے حوالے کر دو۔ اس کے بعد دو رکھڑے ہو کر چاروں طرف افسوں بھرتے ہوئے کہیں گے۔ ”الوداع!“

اس نے میرا راک سنایا نہیں، کہہ نہیں سکتا۔ لیکن اس وقت بارش تھم چکی تھی۔ اور اس کے دامن کی ہوا سے جیسے میری اُداس کٹیہا کے چراغ نے کانپتے کانپتے دم توڑ دیا۔

اس کے بعد طوفانی ہواؤں میں مل کر پاگل بادل کی ایک ہی آواز سنائی دینے لگی۔ ”مجم، رمجم، رمجم!“

جُدائی کا دن!

ہر طرف اس کی جدائی کا راک باز گشت کر رہا تھا۔ طوفانی حوادث کا دستِ ستم میرا گلا دبانے کے لئے دراز ہونے لگا۔ بے چینی اور اضطراب کے ترکش کا مجھے نشانہ بنایا جانے لگا۔ میری آرزوئیں تودہ خاک بن گئیں جذبات پامال ہو گئے۔ آہ! میں بیم ورجا کی جاں گسل گھڑیاں اور مفارقت کی طویل ساعتیں کس طرح گزار سکوں گا۔ اُف یہ تنہائی۔۔۔ تار بکی

خدایا !

جوشِ گریہ میں میں باہر نکل گیا۔ یہاں بھی آنسوؤں کا ایک طعنان تھا۔ اور شہریت و موسیقیت کی تمام شیرینیاں انگڑوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ اداس شام کا آسمان جیسے مجروح ستارے کی طرح تہنچ رہا ہے۔ اور ہزاروں نورانی مشعلیں بادلوں کے سیاہ قافلہ میں مدفون ہو چکی ہیں۔ آم کی کلیوں کے ساتھ سامنے والے قبرستان کی ہوا میں بھی پھولوں کو شگفتہ کرنے لگیں۔ مگر اس شگفتگی کے اندر مجھے مردہ ہڈیوں اور مدفون تتاؤں کی نشانیاں نظر آئیں۔ یہ دیکھ کر میرے حلق سے ایک چچ نکل گئی۔ اُف ! ان پھولوں کی نزاکت کے اندر کتنی لاشیں چھپی ہوئی ہیں۔ ان ہواؤں میں کسی ناکام تمنا کی کتنی آہیں سمائی ہوئی ہیں۔ یہ گریہ وزاری جیسے مجھے بھاگ جانے کا اشارہ کر رہی تھی۔

پرسی کی شادی ہو گئی۔ اور میں بھی اس راز کو چھپانہ سکا کہ میں جنگ میں شامل ہو گیا ہوں۔ اتنا سن کر سبھوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ مجھہ بد نصیب اور ستم کیش کے لئے سپاہیانہ زندگی ہی بہتر ہے۔ لیکن میری اس خبر کو سن کر چھوٹی ٹہن کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ جب میں اس سے ملنے گیا تو بولی "جاتے ہو بھائی جان ! کیا اب واپس نہیں

آؤ گے تم؟ اتنی بڑی ہم میں جا رہے ہو جسے چھوڑ دینا بھی گناہ ہے۔
مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں بہادر بھائی کی بہن ہوں۔ مگر تم مجھے بھول
نہ جانا۔ اگر کسی دن میری بھی ضرورت پڑی تو میں بہ خوشی چلی آؤنگی۔“

میں اپنی پیاری بہن کی زبان سے یہ سپاہیانہ الفاظ سن کر فٹ
مسترت میں بھول گیا۔ جب آنکھوں کے آنسو خشک ہو گئے تو دیکھا بہن
کی پلکیں بھیگی ہوئی ہیں۔ پھر کچھ دیر بعد وہ بولی: ”شاید تمہیں اس بات
کا دکھ ہوگا کہ تمہیں کمانے کیلئے جانے سے نہیں روکا۔ مگر بھائی کیسے بتاؤں
کہ میری طرح سبھوں کی آنکھیں تمہاری مفارقت میں چھپ چھپ کر آنسو
بہا رہی ہیں۔ ہاں بھائی ایک بات اور ہے۔ تم ایک دفعہ اور پری کے
گھر جاؤ۔ آخری ملاقات میں شرم اور لاج اچھی نہیں۔ پری نے جب سے
یہ بات سنی ہے اس کا دل ٹوٹ گیا ہے۔ اور آنکھیں ہر وقت اشک و غم
برساتی رہتی ہیں۔ جاؤ ایک بار ضرور اس سے ملو۔“

مجھے بھی اس بات کا فخر ہے کہ دوائی گھڑی میں میری بہن نے اپنے
شجاعت آمیز الفاظ میں ہمت افزائی کی۔ اس کی آنکھوں کے دو گوہر
آبدار مجھ مسافر کے لئے جدائی کے عالم میں تابناک ستارے ثابت
ہوئے۔

جانبِ تنہا پری یکا یک مجھے دیکھ کر پیروں پر گر گئی۔ اس کی نیم باز

پلیں میری جانب اٹھیں۔ میں نے دیکھا کہ آنسوؤں کے تقاطرِ محبت
سیگوں رخساروں میں ٹپک رہے ہیں۔ اور سینے کی دہلی ہوئی سسکیاں
میرے جذباتِ خفتہ میں رعد و برق کا کام کر رہی ہیں۔ میں نے اپنی
اشکبار آنکھوں کو خشک کر کے اور اس کے سر پر دستِ محبت پھیر کر
کہا: "تھاری عمر دراز ہو۔ ہمیشہ سکھی رہو۔"

وہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ پھر باند از تمکنت رخصت ہو
گئی۔

جب میں نے اپنی شکستہ کُٹیا کے دروازے میں کھڑا ہو کر ایک ما
آخری نگاہِ محبت ڈالی اس وقت احساس ہوا کہ گلاب کے پھول جیسے ہاتھ
مجھے اشارہ کر کے رخصت کر رہے ہیں۔ اور ندی کے اس پار سیلِ درخت
کے قریب معلوم ہوا کہ وہ ایک ایک شاخ میں پریم کے خون آویز دل کو
آویزاں کر رہی ہے۔ اور اس کے آنسو نفعے بچے کی مانند بے تحاشہ
گر رہے ہیں۔

اپنے زخمی دل کو سکون دیکر ایک بار پھر شکستہ کُٹیا پر نظر ڈالی۔
اور بیٹھی ہوئی آواز میں یہ کہہ کر رخصت ہو گیا: "جے۔ مسافر کی
جے۔"

پری کی کہانی

از ہیر بھوم !

تمام باتیں بھول کر ان کی صرف ایک بات یاد آرہی ہے
اور وہ یہ کہ جس کو میں نے شکست خوردہ روشنی کے قریب دیکھا تھا۔ آج
وہ میری زندگی کا ہمارے گلے میں ڈالے ہوئے ہے۔ اور وہی گم کردہ
جانِ نشاطِ روشنی کی مالالیکر میرے دکھ کی تھالی سجا کر بیٹھا ہے۔ اُف
وہ کتنا آس والاس ہے۔ یہ کس دن کی امید ہے۔ اور کس کا انتظار
ہے !

اُس دن جب وہ مجھے الوداع کہنے آئے تھے مجھے احساس ہوا
تھا کہ میرے سارے بندھن ٹوٹ جائیں گے۔ اُف ! میرے خدا ! تو نے
میری چھاتی کے اندر درد و غم کا بھونٹا کیوں بچھا رکھا ہے۔ میرے وجود
مجھ میں قوتِ برداشت عطا کر دینا شرم اور لاج رکھنے کی جگہ کہیں
نصیب نہ ہوگی۔ اگر میں اس دن ضبط نہ کرتی تو شاید آج میرا دل
پاش پاش نظر آتا۔

شاید میری محبت ان کے کعبہٴ دل میں سجدہ ریز ہوگی۔ ان کے

آرام کے لئے ان کی کامیابی کے لئے میں کیوں اس راہ سے قطع تعلق
کروں۔ اگر میری تمام زندگی کا سرمایہ ان کو سکھی کر سکتا ہے تو میرے
لئے یہی باعث مسرت ہے۔

میرا یہ احساس آج مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں ان کے دل کے سارے
توہمات نکال پھینکوں۔ ظاہری اور باطنی حکومت کے درمیان آج عجیب
عزیم کش مکش ہے۔ سماج اور مذہب میری تذلیل کرتے ہوئے کہتے
ہیں :-

”تھارایہ خیال بے بنیاد ہے۔ بہت بڑا گناہ ہے۔“

یہ سن کر دل بانداز استہزا کہتا ہے :- ”میں باطل پر یقین کیوں
کروں؟ جو باطنی حقیقت ہے وہی اصل ہے۔ اس سے دامن کشی کرنا
گناہ عظیم ہے۔ سماج کی فطرت کے ساتھ حقیقت کا ایک دفعہ مقابلہ کر کے
دیکھو۔“

اگر ہم باطنی حقیقت کو چھوڑ کر سماج اور مذہب کو ضرب پہنچانے کی
کوشش کریں تو یہی ہماری بھول ہوگی۔ کیونکہ ہم سماج اور مذہب کی
حقیقت کی باطنی فطرت کو نظر انداز کر کے اس کی ظاہری نمود کو دیکھتے ہیں
اور ہماری طرح حقیقت سے منک اور کون ہوگا۔ ہم اندھے منک کو اچھی طرح
پرکھ سکتے ہیں۔ لیکن ہم اس بات کو قبول نہیں کرتے، بلکہ اس کی مخالفت

میں ہزاروں دلائل پیش کریں گے۔ اگر ہمیں کامیابی ہوگئی تو پھر ہم باطنی حقیقت کو نظر انداز کر کے جس کو شوہر کہتے ہیں۔ اس کا بھلا کیا ہوگا !

دل نے حقارت آمیز الفاظ میں کہا : ہاں ایک دشوار امر کو انجام دینے کے بہانے تم جو اتنی حقیقت کی تذلیل کر رہی ہو، جانتی ہو اس کی سزا کیا ہے؟۔ اگر تم نے اس کا خیال نہ کیا اور باطنی توہمات دھوڈالے تو سمجھو یہی مناسب سزا ہے۔“

دل کا یہ سخت آمیز فرمان سن کر میری آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ مجھے بھی نہ جانے کیوں احساس ہو جاتا ہے کہ میں نے دانستہ انھیں نظر انداز کر دیا۔ مگر آہ پھر بھی سربلندی اور رعونت کی کارستانیاں اپنی جگہ اٹل ہیں۔ محبوب کی نفرت میرے پردہ دل میں برابر منقوش رہے گی۔

کل میری شب وصل تھی۔ عورتیں۔ کنواریاں اور بڑھیاں اپنے نسوانی چوچلوں کے ساتھ۔ مسرت و شادمانی کا اظہار کرنے آئی تھیں نشاط و عیش کی طرب آگیں موسیقیاں اور قہقہوں کی شیریں راگیناں درو دیوار کو شاد کام کر رہی تھیں۔ مگر میرا دل اجڑے ریگستان کی

طرح خاموش تھا۔ اس کی ویرانی اس شکستہ رباب کی سی تھی جھاپنے
تاروں کے ٹوٹ جانے کے بعد کسی گوشے میں پھینک دیا گیا ہو۔ اور
اس کے نفس ہمیشہ کے لئے دفن کر دیئے گئے ہوں۔ میرا دماغ
ایک نامعلوم بارگراں سے بوجھل ہو رہا تھا اور آنکھیں آنسوؤں کے
بار سے جھکی جا رہی تھیں۔ میرے سر تاج نے دستِ محبت سے
میرے بازو کو اپنی گرفت میں لیکر پوچھا: ”کیوں، یہ آنسو کیسے پری؟“
ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

میں نے اپنی اشک بار آنکھوں کو چھپاتے ہوئے دل ہی دل
میں کہا: ”دل کے اندر بہت درد ہے سر تاج!“

جب عورت اس طرح رنج کے آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتی ہے
درحقیقت اسی وقت اس کی باطنی حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔ اس
کے بعد وہ یکایک بول اٹھتی: ”پری! مختار ادکھ مجھے معلوم ہے۔۔۔
مختار سے دل کے اس درد کو کس طرح آرام پہنچا سکتا ہوں، بولو!“
یہ سن کر جیسے میرا احساسِ خفتہ بیدار ہو گیا۔ اور میں نے کہا: ”آپ
کو سب معلوم ہے۔“

انہوں نے تلخ ہنسی ہنسنے کا جواب دیا: ”مجھے یاد ہے اور شاید
مختار بھی معلوم ہو کہ اظہارِ محبت کا ساکتی ہے۔ ہم دونوں نے

ایک ساتھ تعلیم حاصل کی۔ جنگ میں جانے سے قبل اس نے اپنی ساری کہانی مجھے سنائی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بھول سکتا۔ تاہم تمام باتیں جان کر بھی مجھے یہی احساس ہوا تھا کہ میں نے اس کے ساتھ بڑی بے انصافی کی۔ اب سوچ رہا ہوں کہ میں اسے خوش نہیں کر سکا۔ بلکہ اس کے آلام و مصائب میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ شاید اس بد نصیب کی موت بھی سکون کے ساتھ نہیں ہوگی۔ میری زندگی کا یہ پہلا اور آخری جسم ہے۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ کر آزادی کی خواہش کی تھی۔ میں آزادی کا صحیح مفہوم سمجھ نہ سکا۔ اب میں نے اس وعدہ کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے پری! مگر جو سبھوں کو خوش کرنا چاہتا ہے وہ کسی کو خوش نہیں کر سکتا۔ تو کیا ہم اس کو خوش نہیں کر سکتے۔ اُن خدا! اظہر نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اب زندگی بھر واپس نہیں آئے گا۔ اور مجھے اس کی اس بات پر یقین بھی ہے۔ اس نے بھتیس سُکھی کرنے کے لئے مجھے منتخب کیا ہے۔ بو پوری! تم کس طرح سُکھی رہ سکتی ہو۔؟“

میں نے ان کے پیروں میں گر کر روتے ہوئے کہا۔ ”محتاج! تم میری قربت سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹو۔ مجھے اسی طرح اپنے قدموں میں بسنے دو۔“

طرح خاموش تھا۔ اس کی ویرانی اس شکستہ رباب کی سی تھی جہاں پر
تاروں کے ٹوٹ جانے کے بعد کسی گوشے میں پھینک دیا گیا ہو۔ اور
اس کے غصے ہمیشہ کے لئے دفن کر دیئے گئے ہوں۔ میرا دماغ
ایک نامعلوم بارگراں سے بوجھل ہو رہا تھا اور آنکھیں آنسوؤں کے
بار سے جھکی جا رہی تھیں۔ میرے سرتاج نے دستِ محبت سے
میرے بازو کو اپنی گرفت میں لیکر پوچھا: ”کیوں، یہ آنسو کیسے پری؟“
ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

میں نے اپنی اشک بار آنکھوں کو چھپاتے ہوئے دل ہی دل
میں کہا: ”دل کے اندر بہت درد ہے سرتاج!“

جب عورت اس طرح رنج کے آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتی ہے
درحقیقت اسی وقت اس کی باطنی حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔ اس
کے بعد وہ یکایک بول اٹھے: ”پری! مختار ادکھ مجھے معلوم ہے۔۔۔
مختار سے دل کے اس درد کو کس طرح آرام پہنچا سکتا ہوں، بولو!“
یہ سن کر جیسے میرا احساسِ خفتہ بیدار ہو گیا۔ اور میں نے کہا: ”آپ
کو سب معلوم ہے۔“

انہوں نے تلخ ہنسی ہنسنے پر جواب دیا: ”مجھے یاد ہے اور شاید
تمہیں بھی معلوم ہو کہ اظہر من الشمس ہے۔ ہم دونوں نے

ایک ساتھ تعلیم حاصل کی۔ جنگ میں جانے سے قبل اس نے اپنی ساری کہانی مجھے سنائی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بھول سکتا۔ تاہم تمام باتیں جان کر بھی مجھے یہی احساس ہوا تھا کہ میں نے اس کے ساتھ بڑی بے انصافی کی۔ اب سوچ رہا ہوں کہ میں اسے خوش نہیں کر سکا۔ بلکہ اس کے آلام و مصائب میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ شاید اس بد نصیب کی موت بھی سکون کے ساتھ نہیں ہوگی۔ میری زندگی کا یہ پہلا اور آخری جسم ہے۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ کر آزادی کی خواہش کی تھی۔ میں آزادی کا صحیح مفہوم سمجھ نہ سکا۔ اب میں نے اس وعدہ کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے پری! مگر جو سبھوں کو خوش کرنا چاہتا ہے وہ کسی کو خوش نہیں کر سکتا۔ تو کیا ہم اس کو خوش نہیں کر سکتے۔ اُن خدا! اظہر نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اب زندگی بھر واپس نہیں آئے گا۔ اور مجھے اس کی اس بات پر یقین بھی ہے۔ اس نے تمہیں سُکھی کرنے کے لئے مجھے منتخب کیا ہے۔ بو لو پری! تم کس طرح سُکھی رہ سکتی ہو۔؟“

میں نے ان کے پیروں میں گر کر روتے ہوئے کہا۔ ”سرتاج! تم میری قربت سے ایک اپنچ بھی پیچھے نہ ہٹو۔ مجھے اسی طرح اپنے قدموں میں رہنے دو۔“

بہت دیر تک پتھر کی چٹان کی طرح بے حس و حرکت بیٹھ کر انھوں نے مجھے اپنی آغوش میں لیتے ہوئے کہا: "ہمیں پری! قدموں میں کیوں میں بھتیں اپنی آغوش میں جگہ دوں گا۔" پھر اس کے بعد وہ دُورِ مسرت میں مسکانے لگے۔

مگر آہ میرا دل سیما بمنتشر کی طرح آوارہ ہو گیا۔ آنکھیں دُورِ غم میں اشکبار ہو گئیں۔ میں ان سے یہ کہہ نہ سکی کہ انھیں میرے ساتھ محبت کا اظہار کرنا تھا۔ میرے دل محضوں کو اپنی بالاسری سے محبت کا تقدس مآب نغمہ نہیں سنا تھا۔ کیا ان کا یہ قصور نہیں ہے۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ کہنے لگے: "جو چلا گیا اب اس کے لئے ماتم کرنا بیکار ہے پری! وہ بہادری ہے جس اتنا خیال کر لو، جو ہوا وہ خواب کی تاریکی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی دلنوا زراگنی سے آبداروں کے اندر شہابِ ثاقب پیدا کرنے لگے۔ اور ہر غمخیزِ دل نسیمِ بہت سے شگفتہ ہونے لگا۔

مالک! مجھے قوت دے اور میرے دل میں صرف اتنا کہہ دے کہ میں اپنے سرتاج کو دھوکا نہ دے سکوں۔ بتلائے فریبِ کرسکوں ابھی میرا دل صرف بچوں کی طرح رونا چاہتا ہے۔ اپنے پچھلے گناہ کا کفارہ چاہتا ہے۔ میرے دل کو سکون دے، انھیں بھی اور سارے دُکھی انسانوں کو!

آہ! محبت دیکر جو محبت کو حاصل نہ کر سکے اس کی زندگی بہت دکھی اور درد انگیز ہے۔ محبت نہ کرنے سے کسی پر جرم رکھا نہیں جاسکتا۔ مگر کسی کے ساتھ محبت زبردستی بھی تو نہیں کی جاسکتی۔

کیا میں پھر محبت کو سکوں گی؟ کس طرح گذشتہ کہانیاں بھلا دوں! جو رخصت لیکر اور فاتح بن کر اس طرح نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کی باتیں تا دم زلیست نہیں بھلائی جاسکتیں۔ اس بد نصیب کیلئے جس نے اپنی زندگی تلخ کر دی۔ اسے بھلا کیسے فراموش کر سکتی ہوں۔ عورت کی محبت اتنی گری ہوئی نہیں ہے۔

حنا

ابتداء

کوئی بتائے کہ اس بچہ نازکی نزاکت و رعنائی کے سامنے
میری دونوں پلکیں دکھ کے کیف و اثر سے سُرخ کیوں ہو جاتی ہیں؟
میری چھاتی کس کی شانِ دلربائی اور رعنائی کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے
کس فرحت زدہ کائنات کا روح نواز ساز کے پر روتے ہوئے کہتا ہے۔
”یہ کہکشاں، یہ گوہر باریں، شام کا یہ تجلی ریز تارا
اور نعماتِ قدسی کے آنسوؤں کا قطرہ مہتاری آنکھوں میں ہو دیا ہے“

آج شام کو احساس ہو رہا ہے کہ خلا سے محبت کر کے
ایک اوجِ عظیم الشانِ خلائے مجھے پاؤں سے ٹھکرا دیا ہے۔
میری یہ نامتام محبت —

اب معلوم ہوا کہ میرے لئے وجہ تباہی بنی !
اب اس جانِ حیات کی شیریں آواز میرے ہاتھوں کو باندھ نہیں
سکتی۔

سنو، میرا یہ ہمارا انتظار کا نہیں ہے بلکہ دیو کیل کی تمشیر ہے !

حنا

بارودن ٹریچ فرانس !
 آف آگ اور خون کی لانتنا ہی بارش ! اور کتنی بھیا نک آواز !
 آسمان کی نیلی چھاتی کا پتہ تک نہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورے
 آسمان میں آگ لگ گئی ہے ۔ بوں کے پھٹنے سے آگ کی چنگاریاں
 کی جس طرح بارش ہو رہی ہے اگر اسی طرح آسمان کی نیلی آنکھوں
 سے پانی کے قطرے گر رہے تو ایک نہ ایک دن ساری دنیا غرقاں

ہو جائیگی۔ سیلاب اپنے دامن میں پوری دنیا کو لپیٹ لے گا۔
لیکن آج ہم لوگ خوشی و مسرت کی ترنگوں میں مگن ہیں۔

لیکن جنگ کی یہ ہولناکیاں اور عزیز جانوں کی تباہ کاریاں۔
انسان! انسان کے خون کا پیاسا، ایک دوسرے کا گلا کس سفاکی
اور بیدردی سے دبا یا جاتا ہے۔ ہائے اور وادیا کی المناک جینیں
سپاہی کے پتھر جیسے دل کو گداز نہیں کر سکتیں۔ رائفلیں کی گولیاں جب
اپنا سینہ چیر کر انسان کے سینے میں چھید کرتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔
اس وقت موت و حیات کا سماں کتنا بھیانک ہوتا ہے۔

اگر ان اپنی ہنم و فراست اور عقل و دانش کو کسی کام میں نہ لاتا
تو آج وہ فرشتوں کی صفوں میں نظر آتا۔ اُن کلیجہ پھاڑ دینے والی
پیاس! میرے قریب ایک دوست رائفلیں پھینک کر خواب کی
شیریں آغوش میں غرق ہے۔ اگر اسے جگانے کے لئے ہزاروں
گولیاں ایک ساتھ برسائی جائیں تو وہ پھر بھی نہیں جاگے گا۔ وہ
کسی سردار کے احکام کی پروا نہیں کرے گا۔ سات دن ایک
ٹھک جاگتے رہنے کے بعد آج ہتھ خانوں کی کیچڑ میں کتنے سکون کی نیند
سورہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی کو کونین کی راحت مل گئی
ہے۔ کیا پیاس کی بڑھتی ہوئی خواہش اسی خواب کے دامن میں

چوری ہو سکتی ہے۔

اور میری تشنگی پے پے بڑھتی جا رہی ہے۔ چلوں کمار
کی بوتل کے پانی پر ہاتھ صاف کروں۔ کل سے میرا پانی ختم ہو گیا ہے
اس عالم تشنگی میں پانی کا ایک قطرہ کتنا شیریں اور راحت بخش ہے
مرنا سب کوسہے۔ میں بھی مروں گا۔ پھر اس موت کو یاد کر کے
آنسو کیوں بہاؤں! مجھے آلام و مصائب میں ہی راحت ملتی ہے۔
دُکھ اور تکلیف کی رگوں میں آرام و سکون کی بانسری نغمہ زن ہے
اور شبنم نشاں نگاہوں کے اندر امید کی شعلے تیر رہی ہیں۔

آگ اور خون کی تپتی ہوئی فضا میں یہ باتیں بکھ رہی ہوں۔
پاؤں کے نیچے دم توڑتی ہوئی زندگیاں کراہ رہی ہیں۔ اور آسمان
پر پتارے بم برس کر دہشت پھیلا رہے ہیں۔ اور چاروں طرف اُف
کی گولیاں سننا رہی ہیں۔ تاہم ان ہولناکیوں میں گھر کر کا بغل
سیاہ کر رہا ہوں۔ آج ان باتوں کو زیبِ قرطاس کر کے دماغِ قدس
بلکا معلوم ہو رہا ہے۔

قریب ہی مردہ دوست کی لاش کو ٹھکرا کر جگہ بنا رہا ہوں۔
تاکہ آرام لے۔ اُف آرام! آج بدیشی میم صاحبہ نے مجھے کھانے
کے لئے آم گا اچار اور مکھن روٹی عنایت کی ہے۔ لیکن دبی اجاب

مجھے حقارت اور نفرت کی نگاہوں سے گھورتے ہیں۔ ۱، ۱، ۱، ۱۔
روٹی طسوکھ کر بالکل پتھر جیسی سخت ہو گئی ہے۔ دیکھوں یہ روٹی مسخت ہے
یا میرے دانت۔ اچار اب تک تازہ معلوم ہو رہا ہے۔

اس تیرہ چودہ سال کی بدیشی لڑکی نے میرے رخسار کا بوسہ
لیتے ہوئے کہا: "جیسے بھی ہو اس جنگ کو جلد ختم کرنا ہو گا۔" میں سینو
سننے لگا۔

اتنی دیر بعد آسمان پر سفید روئی کے گالے پرواز کرتے نظر
آ رہے ہیں۔ کتنے خوبصورت اور حسین ہیں۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے
کہ اشک آلود آنکھوں کی سفید کیرین پھیلی ہوئی ہیں۔

آج میری آنکھوں میں گزشتہ کہانیاں کیوں لہرا رہی ہیں۔
کیسے بھلاؤں میں انھیں۔ یہ کون جو کیچڑ میں لت پت جا رہا ہے۔
لفٹ رائٹ۔ لفٹ رائٹ! سمجھا سمجھا۔ اور سپاہی ہم لوگوں کی مدد
کرنے آ رہے ہیں۔

سپاہی کے ہاتھ کو ایک گولی چمید کر سنسناتی ہوئی نکل گئی۔
اب وہ مریم پٹی کر رہا ہے۔ مجھے نرس ایک آنکھ بھی نہیں بھاتی۔
عورت اگر پیار کر کے خدمت نہ کرے تو پھر میں وہ خدمت اس سے
کیوں کروانے لگا۔

میرے سامنے ایک نوجوان مُردہ پڑا ہے۔ نہ جانے اس کی
 ”دوسری زندگی“ کس عالم میں ہے۔ اسے کیا خبر کہ اس کا سہاگ مہینہ ابن
 جنگ میں گولیوں کا نشانہ بن گیا۔

لوٹس ایک نشانے میں تیس چالیس گولیاں مار رہا ہے۔ اگر
 میں جانتا کہ بیک وقت اتنے انسانوں کی زندگیاں موت کی بھینٹ
 چڑھ جاتی ہیں تو میں اس کا گلا دبا دیتا۔

بیدرد انسان !

سین ندی کے ساحل میں خیمہ۔ فرانس !
 دودن کے اڑتالیس گھنٹے سوتے ہوئے گزر گئے۔ اب خدا کی
 مخلوق کو راتفل اور مشین گنوں کا شکار بنایا جائیگا۔ میرے کٹھور دل
 کی طرح یہ جنگ بھی انسانی زندگی کے لئے کٹھور ہے۔ چیخ و پکار۔
 در دو کرب، آہیں اور سکیاں کٹھور دلوں کے سامنے کوئی حیثیت
 نہیں رکھتیں۔

آج وہی بدیسی لڑکی مجھے اپنے مکان لے گئی۔ اس کا مکان
 کتنا حسین اور کتنا خوبصورت ہے۔ اس لڑکی کو مجھ سے بہت زیادہ
 انسیت ہو گئی ہے۔ میں بھی اُسے پیار کرتا ہوں۔ اگر میرے ملک کی

لڑکی کسی مرد کے ساتھ ہیں "نازیبا" حرکت کرتی تو سماج چلا اٹھتی —
 "کلجنگ چہتے — مایا جگ ہے — اکیس بائیس سال کے نوجوان کے ساتھ
 کنواری لڑکی اس طرح گھومے — توبہ — توبہ !"

موجودہ دور کے انسان محبت جیسی لازوال دولت کو اتنی
 تنگ نظری سے دیکھتے ہیں — لاجول ولا — ان کی مثال تو ان خونخو
 گدھوں جیسی ہے جو موقع پاتے ہی شکار کی بوٹی بوٹی ٹوچ لیتے ہیں۔
 دنیا میں اتنا گھناؤنا گناہ !

آگ ! تم برسو، برستی جاؤ — خدا کی قہاریت اور جبروت
 اپنے دامن میں سمیٹ کر لاؤ۔

لے صور اسرافیل ! تم انسانی ہستی کو آگاہ کرنے کے لئے اپنا
 کام شروع کر دو۔ بجاؤ اپنا صور — تباہی کی خوفناک بجلی ! بھول
 اور مشین گنوں کو تباہ کر دو۔ کیوں نہ پورا آسمان ان کے سروں پر
 گر جائے جو محبت کو نظر بد سے دیکھتے ہیں — بے حیا انسان !

فرانس — پیرس کے قریب کا گھنا جنگل !
 کل یکا یک اس جنگل میں آنا پڑا — مجھے نہیں معلوم تھا کہ اتنی جلدی
 یہاں آؤں گا۔ یہ ملٹری لائن بہت خوشنما نظر آرہی ہے۔ ایک دن

حکم ملا: ”جلد جلد کام انجام دو“

میں نے پوچھا: ”کیوں؟“

”بھئی پوچھنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ میرا حکم ہے۔“

اس حکم کی تعمیل میں کتنی سنہری سانسیں مدفون ہیں۔ اگر پوری دنیا اسی بانسری کے نغمہ سنجون میں ڈوب جائے تو میں اس زمین میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سما جاؤں۔ کیونکہ یہی ”جنت البقا“ ہے اور یہی ”خیال“ تمام انسانوں کے دلوں کو امید سے مالا مال کر رہا ہے۔ اب ہمیں جرمنی کے ”ہنڈن برگ لائن“ میں لایا گیا ہے۔ اور جنرل ہم لوگوں کو پریڈ . . . کرتا جاتا ہے۔ ہماری مثال گھڑی کی سوئی جیسی ہے۔ جو برابر اپنا کام کئے جا رہی ہے۔

دیکھو اب ہمارے سروں پر گولے کی بھیانک بارش شروع ہونے والی ہے۔ دور، بہت دور آسمان ہوں کے سیاہ دھوئیں سے سیاہ نظر آ رہا ہے۔

سلمے درخت کے عقب میں تاریکی کا ایک سایہ پھیلتا جا رہا ہے لیکن سنگدل ہوتے ہوئے بھی میرا دل دھڑک کیوں اٹھتا ہے۔ رفتار نبض تیز تر کیوں ہو جاتی ہے۔ آہ! اس اندھیری فضا کو دیکھ کر پردہ دل پر عہد پارینہ کے مٹے ہوئے کتے نقوش کچ گئے ہیں۔

اور جب میں سایہ کے تعاقب میں درخت پر چڑھ گیا — میں نے دیکھا — قریب کی برف آلود ندی کتنی دلکش نظر آ رہی ہے اور سامنے بہوں سے تباہ شدہ مکان کس طرح زبان بے زبانی سے دادیلا کر رہے ہیں۔

ان تباہ شدہ اور ویران مکانوں کو دیکھ کر میری آنکھوں میں عہد طفولیت کی تصویر کھچ گئی، جب ہم بچے ریت سے مکان تیار کرتے تھے۔ اور کھیل کے خاتمہ پر اسی مکان کو توڑ پھوڑ کر یہ گیت گاتے ہوئے چلے جاتے تھے ۵

بنایا تھا ہم نے جو مکہ کا گھر وندا

اُسے ہنس کے اپنے ہی پیروں سے توڑا (۱۰)

تظروں سے دور بہت دور بہوں اور مشین گنوں کی جنگیں موری ہیں۔ اور آسمان کی چھاتی پر منڈ لانے والے تارے بھی خوف سے سہم سہم کر روپوش ہوتے جا رہے ہیں۔

اُن اکتی ہیبت ناک آوازیں ہیں۔ اور عظیم الشان طیارے کس طرح غوطہ زن ہو ہو کر پرواز کر رہے ہیں۔ ٹھیک اس طرح جیسے کوئی نشانہ باز چیل کو گولی سے مارتا ہے۔ اور وہ ادھر سے ادھر بھاگتی پھرے۔ وہ سب ہمارے ہی طیارے ہیں۔ اور آسمان

کی بلندیوں پر چرمن طیارے ایسے معلوم ہو رہے ہیں جیسے کوئی سویا
ہو اکیڑا یکا یک جاگ کر بھاگا جا رہا ہو۔

وہ بدیسی لڑکی کئی دنوں سے نہیں آئی لیکن اس اچار کو دیکھ کر
اس کی یاد تازہ ہو گئی۔ نہ جانے میرا دل اتنا نرم کیوں ہے کہ خفتہ
حزبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ اور فراموش شدہ کہانیاں پردہ بخیل
پر عکس ریز ہو جاتی ہیں۔

چند ساتھی آرام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رات گہری
ہو گئی۔ مگر مجھے اسی طرح صبح تک ہتہ خانہ میں رہنا ہوگا۔ جوانی میں پیر
کی باتیں یاد آرہی ہیں۔ یہ کتنی رومان پرور ہوتی ہے۔ بادل کو چیر
کر کس طرح پورنیا کے پہلے دن کا چاند سارے جنگل کو روشن کر رہا
تھا۔ آج بھی سارا جنگل جیسے نوز کے سیلاب میں غرق ہے۔ اور
میرے سر کے اوپر سیاہ بادل کا ایک ٹکڑا کس طرح رہ نور دی میں
مصروف ہے۔

کبھی چاند بادل میں روپوش ہو جاتا ہے۔ کبھی اپنی تابانیاں
پھیلاتا ہے۔ جیسے یہ شہزادہ کی مانند شیش محل میں کنیزوں کے ساتھ
آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ دیکھو کون بھاگا جا رہا ہے۔ چاند یا بادل
میں کہوں گا بادل۔ اور ایک معصوم بچہ کہے گا ”چاند“ نہیں معلوم

کون حق پر ہے ۔

اس وقت روشنی کی پرچھائیاں کتنی حسین ہیں ۔

دور ایک بچھی نہ جانے کیوں اس طرح بول رہا ہے ۔ اس ملک کے بچھی کی آواز کتنی رسیلی اور درد انگیز ہے ۔ سنتے ہی نشہ سا آ جاتا ہے ۔ روشنی کی پرچھائیاں دیکھ کر میرے دل میں کتنی مٹی ہوئی کہانیاں حشر برپا کر دیتی ہیں ۔

مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں نے ایک دن کہا تھا ۔ جنا ! میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں ۔

اور حنا نے اپنی سیاہ لٹوں کو بکھرتے ہوئے جواب دیا تھا ۔
"سہراب ! مگر میں تو تمہیں اب تک پیار نہیں کر سکی ۔"

اس دن بلوچستان کے میدان میں "جشنِ نوروز" کا کھیل ہو رہا تھا ۔ اور میں نے اخروٹ کی ٹھنی سی شاخ توڑ کر بیلے کے پھول سے مرصع کر کے حنا کے گورے گورے پاؤں کے نیچے پھینک دی تھی ۔ لیکن معان سنبل آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے ٹپک پڑے ۔ اور ہندی لگے ہوئے ہاتھوں کی طرح چہرہ سُرخ ہو گیا ۔ میں نے منع توڑ کر بلبل کے قریب پھینک دیا ۔ اور بلبل گیت روک کر اُسے لے اُڑی ۔

انسان سب کچھ پا کر بھی جس چیز کی تلاش کرتا ہے وہی
 چیز اس کی نگاہوں سے بہت دور رہتی ہے۔ یہ ایک ایسا معما ہے
 جس کا سمجھنا دشوار ہے۔
 حنا! حنا!! افسوس!

ہنڈنبرگ لائن!

اُف اب میں کہاں آگیا۔ یہ تو تحت الشریٰ
 معلوم ہو رہا ہے۔ جہاں دیواروں پر یوں کی حکومت ہے۔ زمین
 کے بالکل نیچے اتنا عالی شان اور خوبصورت ہتہ خانہ! یہاں کی
 آبادی عجیب و غریب ہے۔

لیکن میں تو سکون اور عیش و عشرت کی خاطر یہاں نہیں آیا۔
 مجھے تو آرام کی ضرورت ہی نہیں۔ میں صرف درد۔ تکلیف اور سبکی
 چاہتا ہوں۔ میرا احساس عشرت کے سُہرے دامن سے ابھنا
 نہیں چاہتا۔ انسان وہی ہے جو ہمیشہ مصروف رہے کیونکہ
 حرکت کا نام ہی زندگی ہے۔

پھر دل نے فرصت پا کر اسی انگوڑا اور انار سے بھر پور گھر میں
 قدم رکھا ہے۔ پھر دل کے اندر وہی باتیں قیامت بپا کر رہی

کسم کے بھولوں کو بلکو رسے دے رہے ہیں
 کیا اس کے دل میں بھی وہ باتیں یاد آتی ہونگی ،
 مگر آہ اب میں اس کے قریب کس بہانے جاؤں ؟
 پورنیا کی حسین روشن رات
 بار بار آکر بیکل کر جاتی ہے ۔

لیکن جو چلا گیا پھر واپس نہیں آئیگا ۔
 آہ اب میں اس کے قریب کس بہانے جاؤں ۔

لیکن میں کتنا بد نصیب ہوں کہ تمہارے قریب نہیں آنا چاہتا
 میری جماعت کے لوگوں کا خیال ہے کہ دُنیا میں مجھ جیسا خوش انسان
 کوئی نہیں ۔ شاید ان کے خیال کی وجہ یہ ہے کہ میں ہمیشہ ہنستا
 رہتا ہوں ۔ لیکن آہ ! ہندی کے سبز پتے کی آغوش میں جتنے
 خون چھپے ہوئے ہیں اس کی خبر کسی کو نہیں ۔

ایک دن میں نے پیا نو پر بیٹھ کر انگریزی طرز میں ہوم ، ہوم
 سوئٹ ہوم اس انداز سے گایا کہ سارے فرانسیسی متحیر ہو گئے ۔ میں
 موسیقی کا دیوانہ جو کھیرا ۔

کیا کروں کام نہ ہوتے ہوئے بھی کوئی نہ کوئی
 کام تلاش کر ہی لیتا ہوں۔ کل رات کے وقت رینگے رینگے ڈوسل
 چل کر دشمن کے بہتیرے کاٹ آیا ہوں۔ اور کسی کو مطلق خبر نہ ہوئی۔
 اس کام کا صلہ کمانڈر آفیسر نے یہ دیا کہ میں حوالدار بنا دیا گیا
 ہوں۔

آج پھر اسی بدیسی لڑکی سے ملاقات ہوئی۔ دو سال کے اندر
 اس کی خوبصورتی اور حسں میں کتنا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس دن اس
 نے مجھ سے بے ساختہ کہا: ”کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟“
 میں نے کہا: ”نہیں۔“

میرے اس انکار سے اس کی آنکھیں جل تھل بن گئیں اور
 سینہ پھولنے لگا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔
 ”کیا محبت بھی نہیں کر سکتی تم سے؟“

میں چونکہ لاوارث ہوں اسی لئے میں نے جواب دیا ”ضرور“

اس کے بعد وہ اپنی زبان میں الوداع کہہ کر چلی گئی۔

آج کسی گورکھا سے مل بہلانے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں وہ بچے
 کی طرح معلوم ہو رہے ہیں۔ یہ ”گورکھا“ اور ”گارڈیال“ زمانہ

جنگ میں یہ دو ذاتیں کس طرح خوشوار ہو جاتی ہیں۔ الامان ! اگر یہ دو ذاتیں ہمارے ساتھ نہ ہوتیں تو شاید ہم لوگ بھی یہاں نہ پہنچ سکتے۔ ان کے چہرے پر بشارت اور خوشی و مسرت کے ایسے نشانات موجود ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

تہ خانے کے اندر بٹالین مارچ ہو رہا ہے۔ فرانس کے شیریں مینڈ کے ساتھ پیر کی چاپ کتنی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ لفٹ رائٹ لفٹ۔ جھپ، جھپ، جھپ ! ہزاروں انسانوں کے پیر ایک ساتھ اٹھتے ہیں ایک ساتھ گرتے ہیں۔

بلوچستان !

کوئٹہ کے انگور باغ میں میری چھوٹی ٹی گٹیا !
 آج ساری دیسی فوجیں واپس آ رہی ہیں۔ میں بھی آیا ہوں
 یہ دو سال کتنے سکھ اور چین سے گزرے۔
 نہ جانے کیوں اس فرانسیسی دوشیزہ کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں
 یاد آ رہی ہیں۔ پہاڑ کے اوپر بیڑس کے لمبے لمبے بال دیکھ کر اس کے
 گھونگھریلے بال احساسِ خوابیدہ کو جگا رہے ہیں۔
 میں دنیا میں تنہا ہوں اس کے باوجود بھی دل کے اندر کسی

کی یاد کیوں بھل کر جاتی ہے۔ آخر یہ کس کے تسکین آمیز الفاظ ہیں
کون مجھے دلا سادے رہا ہے۔

حنا! حنا! آہ کوئی نہیں — لیکن ہوا میں مل کر یہ
کس کی آواز بھی چلی آ رہی ہے۔ نا، نا، نا!

پہاڑ کی چھائی تھیر کر آ بشار اب بھی بہہ رہا ہے — لیکن
مہندی سے رنگے ہوئے الفاظ جھنیں حنا کی نازک انگلیوں نے
تھریر کیا تھا آج وہ حنا موجود نہیں ہے۔

اس چھوٹے پلنگ پر اس کی کتنی چیزیں بکھری پڑی ہیں۔
حنا، حنا! پھر وہی صدائے بازگشت! نا، نا، نا!!!

پشاور!

آج حنا سے چار آنکھیں ہوئیں۔ میں نے اسے دیکھا —
حنا — حنا! — آج میں نے تمہیں اس جگہ دیکھا ہے —
اسی پشاور میں۔ وہ بھی مجھے چھپ کر دکھیتی ہے۔ اور رو دیتی
ہے۔ کچھ بولتی نہیں۔ صرف مشتاق نگاہوں سے دیکھ کر
اشک ریزی کر رہی ہے۔

ان نگاہوں نے میرے دل کے اندر آنسوؤں کا سیلاب

جاری کر دیا ہے۔ اس نے آج بھی کہا — وہ مجھے پیار نہیں کر سکی۔
 آخر یہ ”نہیں“ بولنے کا کون سا وقت تھا۔ دیکھو وہی ”نا“ ہوا
 میں مل کر فضا میں منڈلاتی پھر رہی ہے۔ دُنیا نے سب کو فتح کر لیا
 مگر عورت کا دل ! —

کابل !

جب میں نے سنا کہ امیر حبیب اللہ خاں شہید ہو گئے تو مجھے
 احساس ہوا کہ اتنے دنوں بعد ہندوکش کی چوٹی پُور چُور ہو گئی ہے
 اور کوہ سلیمان کی اساس بھی اکھڑ گئی ہے۔

دس دن تک میں یہی سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔
 آخر کار دل نے یہ فیصلہ کیا کہ میں بھی امیر کی مانند جنگ و جدل میں
 برا بر حصہ لیتا رہوں گا۔ ممکن ہے لوگ اس پیش قدمی کا سبب
 دریافت کریں۔۔۔۔۔۔ لیکن میرے پاس اس کا کوئی جواب
 نہیں ہے۔

کل صبح سویرے نہ جانے کس بیدار انسان نے انگوڑ کے
 درخت میں آگ لگا دی۔ اُف ! میری طرح اس کا سینہ بھی جل
 کر رکھ ہو گیا۔ وہ بھی سُرخ سُرخ انگارے کا لقمہ بن گیا۔

بلند و بالا آسمان اب روتے روتے خاموش ہو گیا ہے لیکن
 آنکھیں اب تک ڈبڈبائی ہوئی ہیں۔ شاید پھر روئے گا۔ اور
 وہ کوئل جو شاخ پر بیٹھی ہے نہ جانے وہ بھی کس کے بروگ میں آنکھیں
 سُرخ کر رہی ہے۔ کس کے غم میں ”کوہو، کوہو“ کا دردناک گیت
 صبح کی بھیگی ہوئی بھیر رہی ہے۔ شوکنو ندی کے اس پار شہنائی
 کی راگیناں نیرتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں زندگی
 کا اتار چڑھاؤ۔

ان مناظر قدرت کو دیکھ کر میں بول اٹھا: ”حنا! امیر کی مانند میں
 بھی جنگ جو بنوں گا۔ اور میدانِ جنگ سے پھر واپس نہیں آؤں گا۔“
 وہ میری آغوش میں گر کر بولی: ”سہرا اب! میرے پیارے
 جاؤ۔ آج میں اپنے محبوب کے دل کو تڑپانا نہیں چاہتی۔ جاؤ،
 فی امان اللہ!“

آہ! تم میری روح ہو، جان ہو۔ میں نے دیکھ لیا افغانی عورت
 کتنی دلیر اور بہادر ہوتی ہے۔ بہتارے حوصلے کتنے بلند ہیں۔ کیا عورت
 کا دل اتنی مشکلیں برداشت کر سکتا ہے؟

کابل!

میرے سینے کو اب تک پانچ گولیاں چھید چکی ہیں۔ لیکن میں
 وہی ہوں جو پہلے تھا۔ کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔
 میں اپنے وطن میں صبح و سالم پہنچ گیا ہوں۔ اور جیسے حنا
 کی پرچھائیں بھی میرے پیچھے پیچھے آرہی ہے۔ حنا! کس طرح تم
 نے اتنے دنوں تک پہاڑ کی طرح اٹل ہو کر دامنِ محبت استوار رکھا۔
 بولو حنا! بولو!!

امیر نے مجھے اپنے مکان میں جگہ دی ہے۔ آج میں ان کے
 سپاہیوں کا سردار ہوں۔ اور حنا — حنا!! یہاں بھی اس کا
 دل کیوں دھڑک رہا ہے۔ یہاں بھی وہ مجھے ہیقرا کیوں کر رہی
 ہے۔

میں صبح و سالم کیوں چلا آیا۔ مجھے تو اور گھائل ہونا تھا۔ اب
 نیند آرہی ہے۔ شاید اس طرح بارِ غم کم ہو جائیگا۔
 حنا! حنا۔ نا۔ نا۔ نا۔ آہ!

ہرنگا

ابتداءئید

پیارے دیکھو پوس آگیا
 اور دریائے اشک برف بن کر سیلاب کی طرح تھر تھرا رہا ہے
 پوس آگیا —
 آگیا، آگیا راحت جان
 حسین تاروں کے ٹیکے کا نقاب پہن کر وہ دیکھو افتخار بیڈیاں ستادہ ہے

پیارے پوس آگیا، پوس آگیا —
 تھکی ماندی سانسیں، ہسکیوں اور آہونی اوداعی راگیناں
 چور چور ہو گئیں — آہ،
 جاگ مسافر، جاگ، دیکھ ابھی کتنی دور جانا ہے —
 آ، سیاہ آنکھوں کی المناکیاں دھو ڈال !

مہزنگار

جہلم! بانسری کی راگنیاں فطرت کے کلیجے میں نشتر چھو رہی ہیں، او
 میرے چشمِ دل سے درد کے آنسو پھلک رہے ہیں۔ ہم دونوں کی
 کنارہ کشی اس دن ہوئی جب بسیا کھگی اندھیری شام کو درد انگیز
 موسیقی کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ ہم دونوں کے اندر آنسوؤں کی جتنی
 رطایاں قربنا چکی ہیں، وہ بانسری کے ان ہی سُروں سے فضا کی لائنوں

مغرب میں آفتاب کی چتر روشن ہوئی۔ پھر بجھ گئی۔ بانسری
کی درد انگیز راگنی بھی خاموش ہو گئی۔ لیکن میرے کانوں میں اس
قدر آواز سنائی دیتی رہی۔ آہ۔ آہ۔ آہ۔

میں اپنے دل کی چنگاریوں کو دبا کر آنکھوں سے آنسوؤں
کے قطرے خشک کر کے خوشی کی بھیر دیں لاپتے لاپتے جانے لگا۔
مجھ جیسے بدنصیب کی طرح ہزاروں لاکھوں کے قدم اسی راہ سے
گزر رہے ہیں۔ میں بھیر دیں کے سُروں میں ڈوبا ہوا جا رہا تھا جاتے
جاتے میں نے دیکھا کہ میرا ایک دوست طنزورالئے کھڑا ہے۔ اس
نے ہنس کر پوچھا۔ کیوں اختر! شام کی اس بڑھتی ہوئی تاریکی میں
بھیر دیں کے راگ سے تمہیں کیسی خوشی مل رہی ہے۔ آخر تم میں
اتنی تبدیلی کیوں ہو گئی؟ اس وقت میری آنکھوں سے چند قطرے
نکل رہے تھے۔ لیکن میں نے لبوں پر تہمت لاتے ہوئے کہا۔ بھائی!
مہارے راگ کا وقت ختم ہو گیا۔ میرا نہیں؟ اس نے جواب دیا۔
”لیکن یہ تو بتاؤ تمہاری ہنسی آج اتنی تلخ کیوں ہے؟“ یہ سن کر میں
الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

نئی نویلی دلہن کی طرح شام نے اپنے چہرے پر سیاہ نقاب
ڈال دیا۔ اسی وقت آسمان کی لامحدود پہنائیوں میں ایک آوارہ

تارے نے شام کو گھیر کر کہا : شام رانی ! اتنی شرم اور لاج کس پر؟ یہ سیاہ گھونگھٹ کیوں؟ دیکھو چاند دیوتا کی آمد کا وقت ہو گیا۔ یکایک بیچاری شام کے منہ پر ہنسی کی ایک لکیر کھچ گئی۔ اور چہرہ گلزار ہو گیا۔ چاند شہرِ الہی کی طرح لشہ میں مخمور خراماں خراماں نمودار ہوا۔ آتے ہی اس نے شام رانی کا گھونگھٹ کھول دیا۔ شام بھاسی گئی۔ ایک پچھلی جو درخت کی آڑ میں چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ "جج اٹھا۔ ججی، ججی!" اس کے بعد چاند اور شام ایک دوسرے کے ساتھ بغل گیر رہے شام رانی کے گالوں میں چاند کے حسین بوسوں کی لکیریں شعاعِ نو بن کر جھللا رہی تھیں۔ اس حسین لمحہ میں صرف بے شرم تارے کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

میں اپنی اُداس اور سنان گلیاں میں واپس آ گیا۔ چاند کی ضیا باریاں پورے شباب پر تھیں اس لئے میں نے شمع روشن نہیں کی۔ اور اگر شمع روشن بھی کرتا تو شاید اسی کے اندھیرے سے اندھیرے اور روشنی میں کوئی تمیز نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی تاریک روشنی گھر کے اسی کونے کے لئے ہے جہاں میں نے اسے رکھ چھوڑا ہے صرف اس کا دھواں میرے چاروں طرف بل کھاتا رہے گا۔ اُف ! اتنی تاریکی ! ہر وقت ہر ساعت اسی کے ساتھ میری آنکھیں

سبقتی ہے۔ یہی میرا جلیس ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ کبھی نہیں
امنوس میں نے روشنی کے لئے اپنی زندگی کی بہترین ساعتیں گنوا
دیں !

میں نے کہا ”مہرنگار ! مجھے تم سے محبت ہے۔ ایک بار تم
بھی اقرار کرو اور نہ میری زندگی سلغ ہو جائیگی۔ تم میری ہو، صرف
میری ! اگر ایسا نہیں ہے تو بتاؤ فطرت کی ان نہری ساعتوں میں
متمتیں میں نے کیسے پہچان لیا۔ تم ہی میرے خواب کی رانی ہو۔ ہاں
تم میری ہو میری !“

یہ سن کر وہ چلتے چلتے تھم گئی۔ اور اپنی کاجل بھری آنکھوں سے
اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے رنگس آفتاب کی شعاعیں دیکھ کر
کانپ جائے۔ کلسی کو کندھے پر رکھ کر وہ اسی طرح کھڑی رہی۔
پھر بولی ”تم پاگل ہو“

میں نے آنسوؤں کو پیوٹوں میں پیوست کرتے ہوئے کہا۔
”ہوں !“

یہ سن کر اس کی آنکھوں سے بھی دو تین قطرے ٹپک پڑے۔ پھر
جاتے ہوئے بولی۔

”اچھا، میں تمھاری ہوں“

ایک عزیز فانی خوشی کے نشے میں میں بہت دیر تک مدہوش رہا
جب چونکا تو دیکھا وہ دور بہت دور چلی گئی تھی۔

میں نے دوڑتے دوڑتے پکارا "مہرنگارا!" لیکن کوئی جواب
نہ ملا۔ وہ دامن بعل میں کلسی دبائے بھاگی جا رہی تھی۔ یہاں تک
کہ اپنے مکان کے زینے پر چڑھ گئی۔ چڑھتے چڑھتے اس نے اپنا
پاؤں دھویا۔ اور پانی ہترکتے ہترکتے میری آنکھوں سے دور چلا گیا
ساتھی یہ آواز سنائی دی "بھی! گلی کوچے میں اس طرح نام
لیکر پکارنا کہاں کی انسانیت ہے۔ لوگ کیا خیال کریں گے" یہ
سن کر میں جانے لگا۔ راہ الٹی سیدھی تھی۔ ٹھوکر لگی اور منہ کے
بل گر پڑا۔ ناک سے خون کی دھاریں بہنے لگیں۔ میں نے باتیں ہاتھ
سے خون کو روکتے ہوئے کہا: آہ! اب اس طرح سب راہ نہیں
پکاروں گا مہتیں۔"

میرے درد دکھ کو شام نے سمجھا۔ وہی شام جس کی آنکھیں
روشنی دیکھ نہیں سکتیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں بھی جنم کا اندھا ہوتا۔
ہم انسانوں کے لئے یہ کتنا ظلم ہے کہ ایک بار روشنی دیکھنے کے بعد
فریب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

میں نے شام سے دامن کشی کرنے کی جو سو گند کھائی تھی،

وہ جناب آسا ٹھہری۔ اب میں اُسے نہیں چھوڑ سکتا۔ اسے چھوڑ کر
 ہی تو میں نے سینے کے اندر ایک نیا دارغ پیدا کر لیا ہے۔ اُت!
 اس دن پو پھٹتے ہی جہلم کے ساحل پر پھر اس سے ملاقات ہوئی۔
 وہ تنہا ندی میں نہانے آرہی تھی۔ اس کے سر کی سیاہ چمکیلی لٹیں
 اور فیروزی رنگ کا دوپٹہ مجھے بیکل کر رہا تھا۔ اور دور بہت دور
 درخت کی چھاؤں میں گڈرئیے کا چھو کر ایہ راگ الاپ رہا تھا۔
 گوری دھیرے چلو گوری چھلک نہ جائے۔

سر پر لگدی، کمر میں کلسی۔

پتیری کمر یا تیری لچک نہیں جائے۔ ابا ٹوٹ نہیں جائے
 گوری دھیرے چلو۔۔۔۔!

مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ گلنا رہو گیا جیسے سینہ دور کی بکیریں
 کھینچ دی گئی ہوں۔ پھر شرم و حجاب سے لچک کر مجھ سے گویا ہوئی
 ”جی، جی! سٹو بھی یہ کیسی بدحواسی ہے“

میں نے دلدوز آواز میں کہا: ”مہنگا!“

وہ میرے منتشر بالوں، خاک سے اُٹے ہوئے جسم اور بوسیدہ
 لباس کو دیکھ کر کھڑی رہی۔ پھر سُکراتے ہوئے بولی: ”اچھا میرا نام
 مہنگا ہے، بختیں کیسے معلوم ہوا؟ تم نے مجھے اس نام سے کیوں

پکارا؟ وہ تمھاری کون ہے؟“ میں نے محسوس کیا کہ یکایک اس کی آواز خوف اور ڈر کے مارے چکنا چور ہو گئی۔ جیسے چوڑیوں کی جھنکاریں فضا میں کپکپی پیدا کر دیتی ہیں۔ اس کی سانس پھولنے لگی۔ اور سینہ دھڑک اٹھا۔ چاروں طرف آہستہ آہستہ کھڑا سا چھانے لگا۔ میں نے کچھ جرات کی اور اس کے پاؤں کو پکڑ کر کہنے لگا۔ آہ ! تو کیا تم وہ نہیں ہو۔ نہیں، نہیں تم ہی میری ہزنکار ہو۔ وہی حسین روپ، وہی سحر انگیز نگاہیں۔ وہی محبت، وہی گفتگو۔ سب کچھ تو وہی ہے۔ مجھے اور دھوکا نہ دو جان ! تم وہی ہو۔ تم وہی“

اس نے پوچھا تم نے ہزنکار کو کہاں دیکھا تھا؟“ میں نے جواب دیا : ”میں نے اُسے خواب میں دیکھا تھا،“ یس کر یکایک اس کی حسین شکل میں جیسے ہزاروں مشعلوں کی روشنیاں منتشر ہو گئیں۔ اور جھرنے کی مانند ہتھکتے لگاتی ہوئی بولی : ”بتاؤ تم شاعر ہو یا مصوّر؟“

میں نے فوراً کہا : ”مجھے مصوری پسند ہے لیکن مصوّر نہیں ہوں میں نظمیں لکھتا ہوں مگر شاعر نہیں“ یہ سن کر وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔

میں نے پھر کہا ”مہرنگار تم بہت شرمیلو ہو جوتی ہو۔“
وہ بولی : ”اچھا اب میں نہیں ہلٹونگی — لیکن تم کس چیز سے
متاثر ہو کر نظمیں لکھتے ہو ؟“

میں نے کہا ”محبت سے !“
وہ لجاسی گئی ”پھر بولی : ”وہ کون ہے جس کی محبت میں ڈوب
کر نظمیں لکھتے ہو ؟“

میں نے سبز گھاس پر بیٹھتے ہوئے کہا ”تم ہو مہرنگار۔ بھاری
محبت میں ڈوب کر نظمیں لکھتا ہوں۔“ یہ سن کر شرم کے مارے
دوپٹہ کھینچنے لگی۔ اور چہرہ شفقت کی طرح بالکل سُرخ ہو گیا۔ پھر کلسی کو
سنبھالتے ہوئے بولی :—

”کب سے تم نے شاعری کا آغاز کیا ہے ؟“
میں نے کہا ”جس دن میں نے بھتیں خواب میں دیکھا تھا۔“
کچھ پرے ہٹ کر بولی ”تم یہاں کیا کرتے ہو ؟“
میں نے کہا ”موسیقی سیکھتا ہوں۔“
وہ بولی ”کہاں ؟“

میں نے کہا ”خانصاحب کے پاس۔“
وہ تبسم آمیز الفاظ میں بولی : ”ایک دن میں بھقار اگیت سنونگی۔“

سناؤ گئے نا؟“ پھر جاتے جاتے چھپے گھوم کر بولی: ”مختار امکان کہاں ہے؟“

میں نے کہا: ”وزیرستان پہاڑ پر!“
 یہ سن کر اس کے آنسو آگئے۔ پھر غمگین لہجے میں بولی: ”تو کیا تم اس دیس کے نہیں ہو۔ یہاں نئے نئے آئے ہو۔“
 میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: ”ہاں میں پر دیسی ہوں۔ وہ چپ چاپ چلی گئی۔ اس وقت میرے گلے میں دُرُ سامعوس ہونے لگا۔ میں نے گھاس پر لیٹتے ہوئے اُسے پھر پکارا۔
 یکایک زمین پر اس کی کلسی گرنے کی آواز آئی۔ اور غمگین آواز میں گرج کر بولی: ”اس طرح مجھے نہ پکارو۔“ میں نے دیکھا اس کے دونوں رخساروں سے آنسوؤں کیے قطرے گر رہے ہیں۔

اس دن میں نے بہتیری کوشش کی کہ عمدہ سُر میں راگ چھیڑوں۔ لیکن ناکام رہا۔ میرے سُر نے کبھی مجھ سے بیوفائی نہیں کی تھی۔ ہمیشہ اچھے اچھے سُروں میں میں نے راگ چھیڑا۔ جب تجھ کے آنسو کسی صورت نہیں تھتے ہیں تو ماں جھلا کر اس کے گالوں پر طمانچہ رسید کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح میں نے موسیقی کے اوزار کو

عصہ میں چھیڑنا شروع کیا۔ مگر ایک ہی وقت میں ہزاروں اقسام کے راگ پیدا ہونے لگے۔ استاد جی میری اس پریشانی کو انگریزی شرباب کے نشہ میں کھو کر دیکھ رہے تھے۔ پھر سنتے سنتے کہنے لگے: "کیوں اختر آج تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟ اگر دل کا تار درست نہیں تو تار مضرب کیسے درست ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت تو سمجھوں پر روشن ہے۔ مجھے دے، میں سرنکالتا ہوں۔"

استاد جی نے فوراً ایک رنگین اور دلکش سر پیدا کیا۔ پھر میرے ہاتھوں میں دیکر اور کباب کو ٹکڑے کرتے ہوئے بولے "میاں اختر! ذرا باگیسری تو الاپو۔ یہی وقت ہے" مگر آہ اس روز میری آواز دکھ درد سے بھرائی ہوئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اپنے تمام سٹروں کو دریائے جہلم کی تیز حریم لہروں میں غرق کر دیا ہے، کیونکہ جب بھی میں نے گانے کی کوشش کی میرے حلق براگنی بیٹھ جاتی۔ اور دل دھڑک اٹھتا۔ یہ دیکھ کر استاد جی نشہ میں جھومتے جھومتے بولے: "اختر! آج تجھے کیا ہو گیا ہے۔ لا، مجھے دے" اور پھر انھوں نے باگیسری اس انداز سے الاپنا شروع کیا کہ ساری فطرت لہرا اٹھی۔ میں نے استاد جی کا راگ نہیں سنا۔ میرا دل بس وہیں تھا جہاں خواب کی دیوی کے ساتھ

ملاپ ہوا تھا۔

آہ! خواب کے اس احساس میں کتنی تلخ مٹھاس ہے۔ دل میں ہزاروں باریاد آنے پر بھی دل کا بار ہلکا نہیں ہوتا۔ پیاس کی جولانیاں ختم نہیں ہوتیں۔ اے میرے خواب کی دیوی! تم نے میرے نگے میں پیاس کا یہ کیسا ہار ڈال دیا ہے۔ وہ کانٹا جسے تم نے دل میں پیوست کر دیا تھا آج پک کر سارے جسم کو بیکل کر رہا ہے۔ پھولوں کی لڑیوں سے گونڈھا ہوا ہتھارا وہ آسمان اور خوشبودار سے معطر ہتھارا وہ دیس کہاں ہے۔ ہزاروں مشعلوں سے بھرا ہوا ہتھارا وہ محل جہاں تم پردوں میں سرخ رنگ لگا کر زمین کے جگر میں چھاپ دے جاتی تھیں، وہ کہاں پوشیدہ ہے؟ بتاؤ رانی!

آہ خواب کی یہ تصویر کتنی حسین اور امیدوں سے بھرپور

ہے!

اس دن شام کو گشتی کے بعد تھک تھکا کر بچھونے میں لیٹا ہی تھا کہ فوراً نیند آگئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری آنکھوں کے پوٹوں میں مہرنگار کی سہاگ رات کا سارا خواب اُتر آیا ہے۔ اور جیسے اس کے حلاوت بخش بوسے کی تھر تھراہٹ سے میرے

خفتہ احساس میں پھر مری آگئی ہے۔ . . یکا یک میں چونک اٹھا اور دیکھا کہ جہاں دریا اور آسمان ایک دوسرے کو بوسہ دیتے ہیں مصروف ہیں وہیں ایک مینا بدوش حسینہ بالنسری کی حسینے سے کھیل رہی ہے۔ برف کے کلیجے میں جس طرح پور نماشی کے چاند کی حسین و جمیل روشنی بہت دلآویز معلوم ہوتی ہے۔ وہ حسینہ بھی اسی طرح چاندنی کی لہروں میں تنہا راگنی کی سحر انگیز تانوں سے مدہوش ہے۔ اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ اور یکا یک میری آنکھوں سے خواب کا رنگین پردہ ہٹا نظر آیا۔ پھر اس کے بعد میرے کانوں میں بالنسری کی تھرکتی ہوئی راگنی آہستہ آہستہ سُنانی دینے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”وہ جو چاند کی سیہیں شعاعیں دریا کی لہروں میں جھلک کر رہی ہیں وہیں میری گُٹیا ہے۔ یہیں میں بالنسری کی نے سے کھیلتی ہوں۔ یہیں میرے جذبات کے شعلوں سے ہمتاری بالنسری کا بھی ملن ہوتا ہے۔ اور اس وقت میرے دل و جگر میں کیسی تڑپ ہوتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی۔ ایک بار پھر سورج کی آخری کرنوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہم دونوں ملیں گے۔ ساتھ ہی ہماری ملاقات کا وہ وقت بھی آئیگا جب لال شعاعیں مشرق سے جھانکنے لگیں گی۔ اور کہیں دور بہت دور کوئی ہجر کا ستایا ہوا

محبت کا الوداعی راگ چھیڑ رہا ہوگا۔“

میں نے بیکل ہو کر اس کا آنچل پکڑتے ہوئے پوچھا۔ کیا سچ

مچ تم خواب کی رانی ہو۔“

وہ بولی : مجھے پہچان نہ سکے، اختر! میں وہی تمھاری مہر نگار

ہوں۔“

میں نے غم آلود آواز میں کہا : تم نے مجھے کیسے پہچانا مہر نگار؟

— مجھے تو ایسی امید نہ تھی۔ آہ پھاگن کے اس حسین منظر میں دو

ردحوں کی یکایک ملاقات — کیا تمھیں بھی مجھ سے محبت ہے؟“

اس نے اپنے نازک ہونٹ کو جنبش دیتے ہوئے کہا ”نہیں،

نہیں میں تمھیں کیسے پہچان سکوں گی۔ میں تو صرف اس ہلکی ہوا

میں مل کر ہر جگہ جاتی ہوں۔ کل بھی جب میں اس راہ سے گزر رہی

تھی میں نے ٹنا کہ تم میرے لئے باسنری سے سحر آلود راگ کی تخلیق

کر رہے ہو اسی لئے میں تمھارے پاس چلی آئی۔ اختر! میں صرف

تمھاری ہوں۔ میرے ساتھ محبت کا راگ کوئی بھی الاپے یا میرے

روپ کا خریدار بن کر کوئی بھی آئے میں کسی سے محبت نہیں

کر سکتی۔ تم مجھ پر پھر دوسرے رکھو اختر۔“

میرا خواب ٹوٹ گیا۔ کوئل نے چھینا شروع کیا۔ ”اوہو —

”اُو“ پیسے کی آواز آئی ”پیو پیو“ ببل نے شور مچایا ”نہیں ،
نہیں“ اور پھر حنا کی خوشبو میں لپٹی ہوئی ہو آہ کھینچ کر چلی گئی ”ہو،
ہو، ہو“

جس شاخ کو اپنی گرفت میں لانے کے لئے میں گیا تھا وہی شاخ
ٹوٹ کر میرے سر پر گری۔ اور میں نا امید یوں کے سیاہ بادل میں
گھر کر صرف موسیقی کو اپنا سہارا سمجھا۔ اور اس دن سے میری موسیقی
میرے جگر کے ہر تار و رگ میں جھنکار پیدا کرنے لگی۔ لیکن آہ میں تپسہ
جیسے دل اور پہاڑ کی طرح سخت سینے کو اپنی تمام تر کوششوں کے
باوجود بھی نرم نہ کر سکا۔ کبھی کبھی میں مایوس ہو کر یہ پکاراٹھتا ہوں۔
ہر، وزیرستان پہاڑ میرا ہے۔ اس پہاڑ کی بلند و بالا چوٹی پر جب میں
بٹھیں لے جاؤں اور اس کے ہزاروں سنگریزوں سے میرا دم
نکل جائے تو سمجھوں گا کہ میری یہ موت ٹھک کی موت ہے۔ جہاں
ابدی اور لازوال موسیقی ہر وقت بازگشت کرتی رہتی ہے۔ یہی موت
مجھ پر نصیب کے کاروانِ حیات کو شانتی دے سکتی ہے۔ میرا دنیا میں
کوئی نہیں جس کی آنکھیں میری لاش کے سامنے ماتم کریں گی۔ میں مرنے
تھاری موجودگی محسوس کر سکوں گا۔ جس کی چھاتی صرف دھڑکتی رہے گی۔

اور سر کی سیاہ لٹیں منتشر ہو جائیں گی۔ یہی تو میری روح کے لئے باعث سکون ہے۔ آہ کیا ایسا سُہانا وقت کبھی نہیں آئے گا۔ کبھی نہیں ! ایک بار پھر شام سے کچھ قبل اس کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ اس وقت جھینگروں کی جھمیں جھمیں ہنگامہ ریز تھی۔ اس نے ٹھیک دوشیزہ خواب کی طرح ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ ”ذرا یہاں آؤ“

میں نے کہا ”ہنگار کیا خواب کی باتیں سچتی ہوتی ہیں؟“
وہ بولی۔ ”کیوں؟“

میں نے اسے اپنا وہی خواب سنا کر کہا۔ ”اس دن صبح کے وقت تم ہی نے اپنا جلوہ دکھایا تھا۔ اور نام بھی بتایا تھا۔ کیا تم میری نہیں؟“

اس کا دل دھڑک اٹھا اور سانس پھولنے لگی۔ پھر بولی۔
”سنو اختر! میں ہنگار نہیں ہوں۔ میرا نام گاشن ہے۔“
میں نے کہا۔ ”نہیں، نہیں تم ہنگار ہو۔ میں تمہیں ہنگار ہی کہہ کر پکاروں گا۔“

وہ بولی۔ ”اچھا تمہیں اپنا وہ وعدہ یاد ہے۔ آج اپنا گیت سناؤ گے نا؟“

میں نے کہا۔ ”پہلے تم گاؤ میں سنوں گا۔“

بمشکل وہ گانے لگی۔

فراقِ جاناں میں ہم تے ساقی ہو پیا ہی شرابِ کج کے
تپِ الم نے جگر جو بھونا وہ ہم نے کھایا کباب کر کے
اُف ہزنِ نگار! میں نہیں سمجھا تھا کہ منتھاری چھاتی کے اندر اتنی بقیارِیا
ہیں۔ بند کرو اپنا یہ ساز۔ مجھ میں سُسنے کی تاب نہیں۔ اچھا اچھا ہسر
لو اب میں تھیں اپنا گیت سُناتا ہوں۔ سنو!

حیاتِ موت سے بدتر ہے پھر بھی زندہ ہوں
میری طرح کوئی عجبو رِ زندگی نہ رہے
وہ فرطِ غم سے میری زبان بند کر کے بولی۔ "نہیں، نہیں ایب
ساز نہ چھیڑو۔" قدرے توقف کے بعد پھر گویا ہوئی۔ "کیا اسی غمناک
راگ سے تھیں راحت ملتی ہے اختر؟" میں نے اس کا جواب نہیں
دیا۔ اور پھر دوسرا راگ چھیڑنے لگا۔

عقا ہے میرے واسطے راحتِ جہان کی
سوزِ دروں سے بالنسری بجتی ہی راتِ دن
وہ ہنستے ہنستے کہنے لگی۔ "کیا درحقیقت تھیں مجھ سے محبت ہے۔
نہ جانے کیوں میرا دل آج اس حقیقت کو جاننے کے لئے بقیارِ ہو رہا
ہے۔ بولا اختر!" یہ کہہ کر وہ میری گود میں سرنگوں ہو گئی۔ یکایک

چاند کی تمام تر شعاں سیاہ بادلوں کی آڑ میں چھپ گئیں۔ میں نے
غم کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ ”کیوں؟“

اس نے اپنی آنکھوں پر آنچل ڈالتے ہوئے جواب دیا: ”دیکھو
اختر! مقدس چیز کی پوجا مقدس چیز ہی کر سکتی ہے۔ جس راہ میں گناہ
کی معصیت آلود شکل چھپی ہوئی ہے وہاں نیکی کو تلاش کرنا دانشمندی
نہیں۔ اگر سچا رہی گناہ کو لیکر نیکی کی خواہش کرے گا تو اس کا انجام
ہلاکت ہے۔ بالکل اسی طرح تمھاری محبت آئینہ حقیقت کی طرح صاف
شفاف ہے۔ اسی لئے میں نہیں چاہتی کہ تمھاری اس محبت کو اپنی
ناپاک زندگی سے برباد کر ڈالوں۔ آہ اختر! مجھے تم نہیں جانتے۔
نہیں جانتے کہ اس شہر میں جو خورشید جان نامی طوائف ہے میں
اسی کی لڑکی ہوں، یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کا پورا جسم کانپنے لگا
پھر بولی: ”حسن فروش عورت کی میں لڑکی ہوں۔ ناپاک اور بے شرم
میں اپنے کو سر سے پیرنگ گناہ کی زندگی میں پٹی ہوئی دیکھ رہی ہوں
میرا جسم کاٹ کر دیکھو۔ اس سے سرخ سرخ خون نہیں نکلے گا بلکہ سیاہ
اور نیلے رنگ کے قطرے جمے ہوئے نظر آئیں گے۔“ میں نے دیکھا
اس کی آنکھوں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔

بچھو کے شدید ڈنک کی طرح میں نے اپنی چھاتی میں عجیبہتم کی

بے چینی محسوس کی۔ میں نے سوچا جس پھول میں خوشبو نہیں جس کے اندر
 حُسن و جمال نہیں اُسے ہم بُری نظر سے کیوں دیکھیں۔ اسے مجرم کیوں
 ٹھہرائیں۔ اگر اس کا کوئی مجرم ہے تو وہ عرشِ معلیٰ کا خالق ہے۔ میں
 نے زحمتی شکار کی طرح تڑپ کر کہا۔ "نہیں نہیں مہرنگار! کوئی قصور
 نہیں۔ کیا تم ان گناہوں کا کفارہ نہیں دے سکتیں۔ کیا تمہارا جسم
 اور تمہاری روح بلوریں شیشے کی طرح صاف نہیں ہو سکتے۔ مہرنگار!
 تمہیں تو مجھ سے سچی محبت ہے۔ میں نے اس حقیقت کو قبل سے سمجھ
 لیا ہے۔ اور پھر ان دودلوں کے علاوہ دنیا کی کون شے ہے جو اسکی
 اصل کو جان سکے۔ کوئی نہیں۔ جانتی ہو مہر! جب محبت کی روح رونے
 پر مجبور ہو جاتی ہے اس وقت اس کی ہنسی اور حقیقت کی بلندی کو تم
 نہیں سمجھ سکتیں۔ اسے دیکھ کر زمین کے باشندے سوچتے ہیں۔ اب
 ان دو محبت کے دیوانوں کی جدائی ضروری ہے۔ لیکن کیا تم کبھی یہ
 خیال کر سکتی ہو کہ محبت آسمان کی لامحدود چوٹی پر گامزن ہو کر زمین کی
 گہرائی تک پہنچ جائیگی۔ کبھی نہیں۔ محبت تو ان باتوں سے لاپرواہ،
 اوپر ہی اٹھتی رہے گی۔ نہیں مہرنگار! تمہیں میری رانی بننا پڑے گا۔"
 یہ سُن کر وہ میرے قریب تر ہو گئی۔ پھر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں
 کہنے لگی۔ "تم نے ٹھیک کہا ہے اختر! میری زندگی کی بہار روٹنے کے لئے

بہترے آئے اور خوشامدیں کیں، لیکن کسی دن بھی میری آنکھوں سے اس طرح آنسو نہیں بہے۔ جو بھی میرے سامنے پھولوں کی مالالیک آتا میں سمجھ جاتی۔ کہ اس کو مجھ سے کتنی محبت ہے۔ وہ مجھے کتنا پیار کرتا ہے۔ لیکن اس وقت جب اُن گئی گذری کہا نیوں اور مٹی ہوئی باتوں کو یاد کرتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میں نے کتنی بھول کی۔ اختر جس دن تم نے مجھ سے آکر کہا "تم میری ہو" اس دن نہ جانے کس کشش کے زیر اثر دل کے تمام تار جھنجھنا اٹھے۔ اور آواز آنے لگی۔ "ہاں ہاں پیارے میری تمام چیزیں بھاری ہیں۔"

یہ آواز سنکر نہ جانے خوشی و مسرت کی کوئی لازوال لہریں جسم کے روتیں روتیں میں سما گئی تھیں۔ وہ دن میری زندگی کا سب سے سہانا اور رومان پرور تھا۔ کیا ایسی ساعت انسان کی زندگی میں بس ایک بار آتی ہے۔ میں اب تک اسے سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اختر! اتنے دنوں کے بعد میں نے محبت حاصل کیا تھا اور اب تم ہی سے الگ ہو رہی ہوں۔ میرا شیشہ دل چور چور ہو رہا ہے۔ سینہ پھٹا جا رہا ہے۔ تاہم تم سے جدائی اختیار کرنی ہی ہوگی۔ میں نہیں چاہتی کہ جس سے محبت ہے اسی کا وقار برباد کر ڈالوں۔ محبت کی ناقدری مجھ سے نہیں کی جاتی۔ ہم عورتوں کو محبت کی خاطر زندگی قربان کرنا ہی

پڑے گی۔ اُف تم میری راہ میں کیوں آئے اختر! کیوں تم نے میری
 خطہ محبت کو اپنی محبت کی بانسری سے جگا دیا۔ تمھاری محبت سے الگ
 ہو کر بھی سکون نہیں مل سکتا۔ تاہم ہم دونوں کو ایک دوسرے سے
 الگ ہونا ہی پڑے گا۔ جس دل کے اندر محبت جلوہ گر ہے وہیں اہشتا
 کی چنگاریاں نمودار ہوتی ہیں۔ ہمارے نسوانی دلوں میں یقین کا
 مادہ ہی نہیں۔ کیونکہ یہ نہایت ہی نرم اور نازک ہوتے ہیں۔ ذرا سی
 ٹھیس سے فوراً ٹوٹ جاتے ہیں۔ کیسے معلوم ہم عورتیں کب تحت الشری
 سے نکل کر باہم عروج پر پہنچیں گی۔

بس بس پیارے اب میں زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتی۔ مجھے جانے
 دو شاید اب ہم کبھی نہیں مل سکیں گے۔ اگر اتفاقاً نظریں چار ہو بھی گئیں
 تو سن لو اختر ہم دونوں اسی جگہ ملیں گے جہاں آسمان اور سمندر بغل گیر
 ہوتے ہیں۔ اچھا پیارے الوداع! یہ کہہ کر اس نے میرے جلتے ہوئے
 گالوں کا بوسہ لیا اور آٹا ٹاٹا چلی گئی۔

یکایک آندھی آئی شن شن شن! اور میرے کلیجہ میں جیسے ہزاروں
 تیڑ پیوست ہو گئے۔ میں اشک ریز آنکھوں اور منہموم دل کے ساتھ
 چلا آیا۔ واپسی میں لوحِ دل پر صرف ایک ہی بات نقش ہوتی نظر آرہی
 تھی۔ اور وہ بھٹی خواب کی دیوی کی آخری بات۔ آہ! اس نے کہا

تھاتہ ہماری ملاقات آسمان کے اس طبق میں ہوگی۔ اور پھر کسی کی
وداعی بانسری کاراگ دور دراز سے بہتا ہوا سنائی دینگا۔“

اچھا ہوا۔ خوب ہوا۔ بہتر ہوا!

اتنے دنوں کے بعد نہ جانے مجھے کیوں احساس ہوا کہ اس بد نصیب
کو ایک بار دیکھنے جاؤں۔ کیوں نہیں میرا احساس زائل ہو جاتا۔
میں گیا اور دیکھا کہ اس کی کٹیا میں خاک جم گئی ہے اور جنگلی پودے
اُگ آئے ہیں۔ ہر طرف بیوہ عورتوں کی آہ و شیون اور گریہ و زاری
برپا ہے۔ اور — اور اُف! وہ کیا۔ گھر کے آئینے میں کس کی قبر ہے؟
کون ہے جو یہاں اس سسنان جنگل میں محو خواب ہے۔ کس کے ماتم
میں جنگل کی پتیاں سوکھ سوکھ کر گرتی جا رہی ہیں۔ میں آگے بڑھا اور دیکھا
قبر کے سرہانے یہ الفاظ کندہ ہیں۔

اے مسافر! اگر اس راہ سے تیرا گزر ہو جائے تو مجھے دیکھ کر
آنکھیں نہ چرا لینا۔ مجھے صرف ایک قطرہ آنسو کی ضرورت ہے یہ نہیں
معلوم میرا جسم پاک ہے یا گندہ۔ لیکن میں ببانگ دہل کہتی ہوں کہ
مقدس محبت کا نقش میرے جگر میں منقوش ہے۔ اگر تم بھولے بھٹکے
میری راہ میں آ جاؤ تو ماتم نہ کرنا۔ مجھے اس سے بہت دکھ ہوگا۔ اور یہ

تو میں جانتی ہوں کہ ہم جہاں بھی رہیں گے ملاقات ضرور ہوگی۔ کیونکہ
وُینا کے اندر ہم کبھی چھپ نہیں سکتے۔

بد نصیب گلشن !

میری آنکھوں سے آنسو گر کر حروف کو اور بھی اُجاگر کر گئے۔
اسی وقت نہ جانے جہلم کے اس پار کون بانسری سے یہ راگ
الاپ رہا تھا۔

اگر میں باغبان ہوتا تو گلشن کو ٹا دیتا

پکڑ کر دستِ بلبِل کو چین سے جا ملا دیتا

میں سوچنے لگا : ناممکن ہے۔ بالکل ناممکن۔ تمھیں خدا نے
اس کی قوت نہیں دی۔ اور جسے یہ قوت ملی وہ کبھی اپنی زبان سے
ایسا نہیں کہہ سکتا۔ اگر تمھیں ذرا بھی اس بات کا احساس ہے تو ایسا
راگ کبھی نہ چھیڑنا !

لیکن مجھے — مجھ بد نصیب کو یہ راگ ہمیشہ تر پاتا رہا اور شاید
میں ہمیشہ تر پتا رہوں گا۔

خلاف

خدا

بیرہجوم!

آج میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ حیات و ممات کی خاردار
شاخوں سے الجھنے کے لئے آگ اور خون کے بھیانک میدان میں ہمارے
بھائی پیش قدمی کر رہے ہیں۔ خاکی پوشاک کے اندر صرف آگ کی
لال لال تصویریں دیکھ رہا ہوں۔ اور ان کے گلے میں پھولوں کے
ہار لہرا رہے ہیں۔ ان ہاروں میں ہماری ماں کے دل و جگر کے ٹکڑے
گندھے ہوئے ہیں۔ ہمارے بھائی کی دُعائیں سمائی ہوئی ہیں۔ اور

ہماری بہن کے آنسوؤں کے شفاف قطرے روشن ہیں۔

پھول کے یہ ہار کتنے جانفزاہیں — ان کے اندر دکھ کی کتنی شیرینیاں روپوش ہیں۔ لیکن آہ! کوئی میرے دل سے پوچھے، تو میں کہوں گا جنہیں تم پھول سمجھ رہے ہو درحقیقت وہ پھول نہیں ہیں۔ وہ تو ہماری ماؤں اور بہنوں کے خشک آنسوؤں کی بوندیں ہیں۔

آج ان سپاہیوں کی خاکی پوشاک صبح برشگال کی سمیش عاؤں میں کتنی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ اور بارش کی ان بوندوں کو دیکھ کر مجھے خیال ہوتا ہے کہ ہماری ہی پلکوں کے موتی ہیں۔ برسات کی بوندیں اور ماں کے الوداعی آنسو — ان دونوں میں کتنا اتصال ہے۔

لیکن وہ سب داغِ مفارقت دے گئے۔ یکے بعد دیگرے ٹھیک آسمان کی سنہری گود میں پچھلے والے ان تاروں کی طرح جو آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے دم توڑ دیتے ہیں۔

آہ! اس وقت کی تصویر کشی میں کس طرح کروں جب جو ان امیدیں بھوک کی خاطر اپنے اپنے عزیزوں سے بھڑھری تھیں — بنگال کا آسمان اور بنگال کی ہوا آنسوؤں کے سیلاب میں جیسے ڈوب

گئی تھیں۔

نہ جانے ان بد بختوں میں سے پھر کون آگ اور خون سے بچ کر واپس آئیگا۔ کس کی بھوک کی آنکھیں اور مڑھ جائے ہوئے دل پھر وطن کو لوٹ آئیں گے۔

ماننخور!

ماں آخر تم مجھے کیوں روک رہی ہو۔ کیوں تم آگ کی پکتی ہوئی چنگاریوں کو محبت کی بھاری بھر کم چٹانوں سے دبا دینا چاہتی ہو۔ اچھا ماں! میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، بولو گی؟ بولو کیا تم کسی بی۔ اے پاس لڑکے کی ماں بننا چاہتی ہو؟ یا بہادر لڑکے کی؟ بولو اس گونگے اور بزدل دیس میں کتنی مائیں ہیں جنہوں نے بہادر بچے جنم دیئے۔ جواب دے سکتی ہو۔ اگر نہیں تو پھر مجھے روکتی کیوں ہو؟ میرے پتھر جیسے دل کو اپنے نرم دگداز آنسوؤں سے باندھنا کیوں چاہتی ہو؟ تم اپنے جنم کے پاگل بچے کو چھوڑ دو!

آج مجھے جنگ میں جانے کا حکم ملا ہے۔ اور میری آنکھیں خوشی سے جھوم رہی ہیں۔ ٹھیک اس بچہ کی طرح جس کا دل پتھر کا ٹکڑا وقت ایک عجیب خوشی سے دو چار ہوتا ہے۔ ماں! آخر اوداعی گھڑی میں

یہ آنسوؤں کی جھڑی کیوں : میں جا رہا ہوں مجھے جانے دو۔ سکون
دو ماں !

جب آسمان کی چھائی کے تمام گرد و غبار بارش کے قطروں سے
دھل جاتے ہیں اس وقت اس میں کتنی دکھائی دیتی ہے۔ کتنا بھلا
معلوم ہوتا ہے میں بھی اپنی زندگی کی تمام آلائشوں کو دھو رہا ہوں
تاکہ مجھے مستقبل میں کوئی سکون ملے۔ مجھے معلوم ہے کہ ماں کی منتیں
کچلی جا رہی ہیں۔ ان کی بوڑھی امیدوں پر ناامیدیوں کی ضرب لگائی
جا رہی ہے۔ تاہم میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ آج مجھے تمام لوگ
ہدفِ لعنت بنا رہے ہیں کہ میں ماں کو تنہا چھوڑ کر جا رہا ہوں، ان کے
خیال میں یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ لیکن میں ان نادانوں کو کیسے بتاؤں
کہ میرا یہ فیصلہ محبت کو اور مضبوط کر دیگا۔

سالار !

رہ رہ کر میرے دل میں وہی تصویریں منقوش ہو جاتی
ہیں جب میں سبھوں سے دواغ ہو رہا تھا۔ اتنا بھیانک اور ادا اس
منظر میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ سوچتا ہوں آخری ملاقات
میں دل کے کتنے تازک شیشے آن کی آن میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ کتنی

آرزوئیں راکھ ہو جاتی ہیں۔ اور کتنے آنسو خون میں منجمد ہو جاتے ہیں۔

ایک عجیب آفت میں جان بچتی۔ میں نے جنگ میں جانے کی کیا ٹھانی لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ جنھوں نے مجھے سو بار دیکھا تھا وہ بھی دبے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ شب و روز بس یہی چرچا تھا کہ میں جنگ میں جا رہا ہوں۔

بوڑھے، جوان، بچے سب مجھے روزانہ اُداس اور غمگین نظروں سے دیکھتے اور چلے جاتے۔ راہ چلتا تو انگلیاں اٹھتیں۔ اور ایک دوسرے سے کہتے: ”دیکھو، دیکھو یہی خوبصورت جوان جنگ میں جا رہا ہے!“ خدا خدا کر کے لوگوں سے رہائی ملی۔ ان لوگوں سے جن کے اداس چہروں میں جنگ کی تصویریں نارچ رہی تھیں۔ جنگ میں جانے سے قبل یہ جنگ! للجب!!

سب سے زیادہ ہجوم بوڑھے سٹیشن پر تھا۔ اُف! ہم سپاہیوں کے چہرے دیکھنے کیلئے لوگوں میں کتنا اضطراب تھا۔ کتنی گھبراہٹ تھی جن لوگوں سے میری شناسائی بھی نہیں تھی ان کی آنکھیں بھی شبنم فشاں تھیں۔ اور لرزتی ہوئی آوازیں خدا حافظ ”کہہ رہی تھیں۔

ریل گاڑی ! صبح کا وقت !!

پانی سے دھلا ہوا یہ آسمان کتنا خوبصورت ہے۔ کتنی حسین ہے یہ خاموش صبح ! ساری فطرت خواب سے جاگ کر اب انگڑائی لے لے کر اُفق کے کنارے گلابی تار کے جال کتے بھلے معلوم ہو رہے ہیں۔ اب کچھ دیر بعد شفق کی ان سُرخیوں سے آفتاب کی تخلیق ہوگی۔ اور ساری دُنیا پھر اپنے دھندے میں مصروف ہو جائیگی۔ پھر وہی چیخ دھپکار، وہی شور و غل !

احساس ہوتا ہے کہ سارا ملک اپنے اپنے خوابِ استراحت سے اب بیدار ہو رہا ہے۔ اور اس نیند سے بوجھل آنکھیں اس آسمان کی طرف اٹھی ہوئی ہیں۔

کسی ماہرِ طبیبی کی مانند ریل گاڑی بھی اپنا طبلہ بجاتے ہوئے پیش قدمی میں مصروف ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی آواز میں بھیرویں کے سُر ملے ہوئے ہیں۔ مگر آہ اس وقت اس کے ساتھ ساز چھیڑنے کی آواز کہاں سے لاؤں۔

مدھوپور !

آفتاب صبح کی سیمیں شعاعیں چہرے پر پڑ کر کسی نئے دھک کا آغاز

کر رہی ہیں۔ ہمارے چاروں طرف سپاہی محو خواب ہیں۔ یہ روپہلی
 کرنیں ان کے معصوم چہرے پر کتنی بھلی لگ ہیں۔ مگر یہ کیا ان کی آنکھوں
 میں اب تک آنسوؤں کے قطرے جھلک رہے ہیں۔

آج نہ جانے کیوں میرے دل میں اس حسینہ کی یاد تازہ ہو گئی۔
 اس وقت چاروں طرف کچھ تاریکی اور کچھ روشنی نظر آ رہی ہے۔ وہ دن
 بھی ٹھیک آج ہی جیسا تھا۔ وہ مجھ سے کبھی کچھ نہ بولی اور نہ بول سکی
 میں بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن نہ جانے کس طرح ہمارے دلوں نے ایک دوسرے
 کی پوشیدہ باتیں معلوم کر لی تھیں۔ اُف! جوانی کی پہلی منزل میں محبت
 کا یہ کتنا پائندہ ہوتا ہے۔ آہ! اس دن بھی میں کچھ نہیں کہہ سکا جب
 میں اس کی شرابی آنکھوں سے غروب آفتاب کی طرح بڑی سرعت
 سے بھاگا جا رہا تھا۔ صرف آنسو کا ایک قطرہ پلکوں میں تھر تھرا رہا تھا۔
 وہ بھی کچھ نہ بولی۔ جب تک میں مکان میں رہا وہ صرف اشک ریزی
 میں مصروف رہی۔ اور اس دن جب میں جُدا ہو رہا تھا وہ دیوار کے
 ستون سے لگ کر کس طرح غم کا اظہار کر رہی تھی۔ ماں نے میرے دُکھ
 کو تاڑتے ہوئے کہا:-

”میرے لال جاؤ۔ جاؤ رفیقہ کو ایک نظر دیکھ لو۔ رور و کروہ اپنی
 جان دیدیگی“ مگر میں نے مُنہ پھیر کر جواب دیا: ”امی! میں نہیں جاسکتا

رفیقہ کے پاس !“

لیکن آہ ! آج مجھے رفیقہ کا وہی گیت اور وہی سُر ملی تا نہیں
یاد آ رہی ہیں :-

” اسی سُنہرے آسمان کے زیر سایہ ہم دونوں میں ملاقات
ہوئی تھی ۔ آنکھیں نیچے جھکی تھیں اور زبان ساکت ! پھر
قدم کو حرکت ہوئی ۔ اور وہ چلی گئی ۔ اس حسرتناک منظر
کو دیکھ کر ننھے ننھے شوخے گرنے لگے اور ہوائیں آہیں
بھرنے لگیں ۔ دو دلوں کی پوشیدہ باتیں دل ہی دل
میں دفن ہو گئیں ۔ اور دل کی آرزوئیں آنکھوں کی
راہ بہہ گئیں ۔ اس کے بعد اور ملاقات نہ ہوئی ۔ زندگی
کا وہی اکیلا پن چوٹی کی طرح کاٹنے لگا ۔ آہ جتنا کنا ہے
جدا ئی کا وہ المناک منظر ۔“

آج کی صبح میں کتنی اُداسی ہے ۔ اور شبنم کی بوندیں گھاس
پر اس طرح چمک رہی ہیں جیسے کسی دوشیزہ کی مخمور پلکوں میں آنسوؤں
کے جمع شدہ شفاف قطرے !

گاڑی جا رہی ہے ۔ اس کی سیٹیاں کتنی بھیانک معلوم ہو رہی
ہیں ۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی یدِ نصیب گرجا کی گھنٹیاں بجانے میں

مصروف رہتا ہے۔

نزد لاہور۔ نصف شب !

خوفناک آنکھ کی طرح گاڑی بھاگی جا رہی ہے۔ چاروں طرف
دھوئیں کے بادل پھیلے ہوئے ہیں۔ تاریکی۔ گہری تاریکی۔ اندھیرا
ہیبت ناک اندھیرا !!

نصف شب کی تاریکی کی طرح میرے احساسات بھی تاریک ہو چکے
ہیں۔ میرا باطن بیکل ہوتا جا رہا ہے۔ اور تصورات کے پردے چاک
چاک ہو رہے ہیں۔ میں کہاں جاؤں، کدھر جاؤں۔ یہ بھیانک
رات، درختوں کی گھنی شاخیں اور ریل کی خوفناک چنجیں۔ میرے
سارے ساتھی مجو خواب ہیں۔ ان کے کپڑے خاک آلود اور تارتار
ہیں۔ ہونٹوں پر پٹیریاں جھی ہیں اور چہرہ غم سے ڈھلکا ہوا ہے۔
اب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ کاش کوئی میرے سینے میں
چھری بھونک دے۔ میری آنکھیں نکال لے۔ میرا احساس نہ جانے
کیوں مجھے بار بار اسی راہ میں گھسیٹ لاتا ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ساری دنیا کسی بچے کے سوگ
میں ماتم کناں ہے۔ اور ہواؤں میں یہ چنجیں منتشر ہو رہی ہیں۔

اُف اُف، اُف ! یہ ریل بھی اس غم آلود منظر کا ساتھ دیتی جا رہی ہے۔

نوشتہ !

آؤ میرے گونگے اور بہرے ساتھیو آؤ۔ آج کتنے دنوں کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے ملے ہیں۔ تمھاری یاد اور تمھارا خیال میری شہ رگ کے بالکل قریب رہتا تھا۔ آؤ، آؤ !!
 آہ ! کتنی روشنی ہے۔ مگر یہ کیا؟ یہ کس کا خیال ہے جو رہ رہ کر میرے جگر میں خلش پہنچا رہا ہے۔ یہ کس کی آنکھیں ہیں جو مجھے حسرت سے گھور رہی ہیں۔ لیکن اب اس سے جُدائی اختیار کرنا ہی ہوگی۔ مدت کے اس بندھن کو کاٹنا ہوگا۔ لیکن کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ کیا میں رفیقہ کی یاد فراموش کر سکتا ہوں۔ اُف کتنا المناک خیال ہے یہ؟

ضمیر نے کہا۔ ہاں اب دلوں کی باتیں دلوں کے اندر رکھنی ہی ہوں گی۔ محبت کی داستانیں پھیرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔ اندر اور باہر جتنے روحان پرورش پارے ہیں انھیں ریگستانی میدان میں تبدیل کر دینا ہوگا۔ جانتے ہو پھر اس کے بعد کیا ہوگا۔؟

ہماری آنکھوں کے سامنے ایک ایسی دُنیا ہوگی جہاں محبت کی حکومت
ہوتی ہے۔ صرف محبت کی — !

بہتوں نے اپنی قیمتی زندگیاں تباہ کر ڈالیں۔ لیکن کیا دل
کے اس مخفی راز کو الگ نہیں کر سکتے۔ بہر کیف تمھیں ناممکن کو ممکن کرنا
ہی ہوگا۔ اگر تم میں اتنی ہمت نہیں ہے تو پھر آسمان کی لامحدود وسعت
میں کیوں بھاگ رہے ہو۔ جس دل کے اندر خواہشات اور تمنائیں
پرورش پاتی ہیں اسے اپنے کو بہادر کہتے لاج نہیں آتی ؟

آج تصور میں ماں اور بھابی مجھے حسرت آگیاں نگاہوں سے
دیکھ رہی ہیں۔ ان کے لب کچھ کہنے کو ہڑھڑا رہے ہیں۔ ان کی اوٹ
میں ایک پریمچہرہ شبنم نشاں آنکھوں سے دیکھ کر یہ کہہ رہی ہے ”پیارے
مت جاؤ، مت جاؤ جان تمنا“ لیکن ضمیر کہہ اٹھتا ہے ”تمھیں جانا
ہی ہوگا۔ سنگدل بن جاؤ، کٹھور بن جاؤ“

ہاں، ہاں اے دل سخت ہو جا، پہاڑ کی طرح اٹل۔ آج تمہاری
آزمائش کا دن ہے۔ آج کابل کے اس دریا کی تیز خرام لہروں میں
محبت کی تمام تر زنجینیاں عرق کر دینی ہوں گی۔

کردستان !

آج ایک سال کی طویل مدت کے بعد نہ جانے کیوں میرا دل بے اختیار جھج رہا ہے۔ آخر دل کے ساتھ یہ جنگ کیسی؟ ظاہری جنگ سے باطن کی جنگ کتنی بھیانک اور ہولناک ہوتی ہے۔ جنگ کے فاحش بہتیرے ہو سکتے ہیں لیکن من کا فاحش کون ہو سکتا ہے۔ بتاؤ کوئی مجھے بتاؤ۔ میں ان گتھیوں میں کب سے ابھا ہوا ہوں۔ میرے دل کے اندر یہ کیسا ہنگامہ برپا ہے۔ یہ ہنگامہ نہ تو مسرت کے لئے ہر نشانی کی تکمیل کے لئے۔ نہ آسودگی کی خاطر اور نہ محبت کے واسطے۔ نہیں مجھ سے اتنی بڑی قربانی نہیں ہو سکتی۔ میں اس قدر کٹھن آزادی نہیں چاہتا۔ تاہم نہ جانے کیوں پتھر کی طرح سخت چھاتی میں کسی کے تصور کی روشنی دل کو چھو جاتی ہے۔ اُف! صرف چھو جاتی ہے اور خاموش۔ تاہم میرا مغرور دل بولنا نہیں چاہتا کیونکہ روشنی کا ایک یہی ذرہ میرا پیا بسیر ہے۔

آج اس عربی فطرت کی آغوش میں فضا کتنی حسین اور محبوب معلوم ہو رہی ہے۔ کاش اس وقت میں سرزمینِ وطن میں ہوتا اور وہاں کی فضا بھی اسی طرح عروسِ نوبن کو ظاہر ہوتی۔ شاید دُنیسا کے کسی گوشے میں یہاں جیسی جھلسا دینے والی گرمی نہیں ہوگی۔ چاندنی رات میں میری تصویر کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کریگا کہ درحقیقت یہ میری

تصور ہے بلکہ یہ گمان ہوگا کہ موسم خزاں کے آفتاب کی سنہری روشنی ہے۔

آج میں ایک اور سخت مصیبت میں اسیر ہو گیا ہوں۔ زکس کی کلیوں کی طرح رنگین، ایک بدوی حسینہ مجھے اپنی گرفت میں لئے بیٹھی ہے۔ اور کہہ رہی ہے کہ مجھے اس کے ساتھ شادی کرنی ہوگی آخر یہ کیسی زبردستی ہے۔ میں جتنا بھی انکار کرتا ہوں وہ اور اصرار کئے جاتی ہے۔ کہتی ہے اس کے دل میں میری بہت زیادہ محبت ہے۔ اور میں کہتا ہوں مجھے اس سے کوئی محبت نہیں ہے۔ میں اس کی جس قدر منت و سماجت کرتا ہوں کہ مجھے چھوڑ دو۔ وہ قہقہہ لگا کر کہنے لگتی ہے "مجھے تم سے گہری محبت ہے۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے" اُن ہلکتی زبردستی ہے یہ!

کر بلائے معلیٰ!

سامنے میدان میں گھسان کا رن پڑا تھا۔ جس کا نام سن کر مسلمان مردوں اور عورتوں کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور دل اُمتد آتے ہیں۔ اس سرزمین میں آکر ہزاروں سال قبل کی تصویریں میری آنکھوں میں پھر جاتی ہیں۔ جب بہادر نوجوان بنتے ہتے شہید ہو جاتے

تھے۔ دریائے فرات آج کس شان سے بہہ رہا ہے جس کے ایک قطرہ پانی کے لئے دودھ پیتے بچے اصغر نے باپ کی گود میں تیرکھا کر پیاس بھری آنکھوں سے دیکھ کر دم توڑا تھا۔ نہ جانے فرات کی آغوش میں کتنے نوجوانوں کے مقدس خون ملے ہوئے ہیں۔

بہت دور تک پھیلے ہوئے آسمان کی طرح ریگستان اپنا ریت بھرا آنچل پھیلاتا ہوا چلا گیا۔ ہے اور دو چھوٹے چھوٹے معصوم بچے پیاس سے بیقرار ہو کر ماں، ماں کہتے ہوئے فرات کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان بھیانک مناظر کو دیکھ کر آنکھوں کے سامنے کربلا کی ایک دلدرد تصویر گردش کر رہی ہے۔

اس دن بدوی حسینہ سے پھر ملاقات ہوئی۔ آخر وہ کیوں میری راہ میں خلل انداز ہو رہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ فرات کے کنارے کنارے عربی گھوڑے پر چڑھ کر عربی گیت گاتی ہوئی آ رہی ہے۔ اس کی آواز کتنی دردناک ہے جو میرے جگر میں تیر کی طرح پیوست ہو جاتی ہے۔

میں نے کہا: ”چھی گل! آخر کیسی بدحواسی ہے۔ میرے دل میں محبت کا ایک ذرہ بھی نہیں ہے۔ پھر محبت کروں تو کیونکر؟“ وہ ہنسی اور خاموش رہی۔ میں نے پھر کہا: ”سنو! مجھ سے محبت کرنے کا تمہیں کوئی

حق نہیں ہے۔“ یہ سن کر وہ اپنی نرم و گداز انگلیوں سے مجھے چھوتے ہوئے
 بولی۔ ”اگر حق نہیں ہے تو میں تم سے محبت کیوں کر رہی ہوں؟“
 کیا اس کے بعد بھی اس حسین و دشیزہ سے کوئی کُفَلُو ہوئی؟

عزیز یہ !

کتنے دنوں بعد یہاں پہنچا۔ لیکن گل بھی یہاں پہنچ گئی۔ سنتا ہوں
 اس دیس کی دوشیزائیں بالکل آزاد ہیں کسی کی غلام نہیں۔
 ایک بار جس سے محبت ہوئی ہے اس کو رہتی زندگی تک نہیں ٹھٹھکتیں
 یہی درحقیقت سچی محبت ہے۔ اس کے اندر مجاز کا گداز نہیں۔ مگر میں تو اس کو
 نہیں چاہتا۔

کل جب گل میرے سامنے گھوڑا دوڑاتے ہوئے جا رہی تھی اس
 وقت اس کی زنگی آنکھیں جیسے کسی نامعلوم درد سے کانپ رہی تھیں۔
 اور اس کی آواز ریت کے ذروں سے ٹکرا کر چلی آ رہی تھی۔ ”بہت دُعا
 دی تو نے ظالم!“

میں نے کہا ”میرا کاسہ گدائی تو بالکل خالی ہے۔ تمہیں دے
 کیا سکتا ہوں۔“

وہ گھوڑے سے اتر پڑی۔ پھر اس نے اپنے فیروزہ رنگ کے

دو پٹے کو سر پر رکھتے ہوئے کہا : ”مختار اکاسہ گدائی میں بھر دوں گی۔“

میں نے جواب دیا : ”نہیں یہ تم سے نہیں ہو سکتا۔“

وہ بولی : ”جھوٹے — بے رحم!“

آہ گل ! تم نے میرے دل میں کیسی نئی برجھی چھو دی ہے۔ کیوں تم

نے میرے پتھر جیسے دل کو اتنا نرم کر دیا۔ آہ !

اے آسمان کے آزاد پرندو ! کدھر پرواز کرتے جا رہے ہو۔ کچھ

خبر بھی ہے آؤ ذرا میری اس سُنہری زنجیر کو کاٹ دو۔

بست کی آخری نصف شب کو !

اب میرا دل نہ جانے کیوں کھپا کھپا سا رہتا ہے۔ اور آنکھوں کے

قطرہائے اشک رونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ آزادی کی یہ خوشی غلامی

سے زیادہ یاس آگیاں ہے۔ میری زندگی ایک خلا ہے جہاں اُداس اور

سنان ریچستان پھیلا ہوا ہے اور سراب صحرا کی جھلک نمایاں ہے۔

صبح مجھے ایک خط ملا جس میں تحریر تھا کہ رفیقہ کسی کے گھر کی زینت

بن چکی ہے۔ آہ ! اپنے دل کی وہ المناک کیفیت کیسے بتاؤں کہ اس

منحوس خبر کو سن کر میرا ظاہر و باطن کتنا بیکل ہو گیا تھا۔ اس دن سے میں

برا برا اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کر رہا ہوں۔ تمام دنیا میری نظر دلا

میں سوئی بن گئی ہے۔ تصورات کے پردے چاک چاک ہو گئے ہیں۔
میں بھلانے کی جتنی کوشش کرتا ہوں اتنی ہی اس کی یاد پریشان کرجاتی
ہے۔ آخر میں کیا کروں زندگی کی کونسی ایسی شاہراہ ہے جہاں محبت اور
نفرت کا وجود نہیں۔ جہاں متضاد کیفیتیں نہیں ہیں۔

رفیقہ! بھول جاؤ، خدا کے لئے مجھے بھلا دو۔ میری تمام باتیں
اور میرے تمام تصورات اپنے دل و دماغ سے یکسر نکال پھینکو۔
سمجھ کی اس تاریک اور پُرپرہیز راہ میں تم کیوں کسی کو اپنا بنانا چاہتی
ہو۔ سماج محبت کی دشمن ہے، قاتل ہے، جلاد ہے۔ تم کیوں اس
کی چاہ میں بیقرار ہو جسے پا نہیں سکتیں۔ اُن ری اندھی متنا۔ آج میرے
دل و جگر کی بیقراریاں کو وہ آتش فشاں کے گرم گرم لاوے کی مانند تیر
رہی ہیں۔ اور آنکھوں کے آنسو سماج کی گندی راہ میں پھرتے رہے
ہیں۔

بھول جاؤ رفیقہ! بھول جاؤ۔ نئی خوشی کے لئے پُرانی خوشی کو بھلا
دو۔ بھتیں کوئی حق نہیں کہ میرے ساتھ محبت کا راگ الاپو۔ اور نہ
مجھے حق ہے کہ تمہاری یاد میں بیقرار ہوں۔ شوہر کی محبت سبھوں پر
مقدم ہے رفیقہ!

رات کا وقت تاروں کی حسین نظریاں اور چاند کی ضو فشاں کی ہیں

کتنی سہانی معلوم ہو رہی ہیں۔ اس وقت وہی بھولی ہوئی باتیں میرے چاروں طرف آنکھ مچولی کھیلنے آتی ہیں۔ اور میں ساکت بُت کی طرح صرف ایک ٹک آسمان کی لامحدود پہنائیوں میں کھوجاتا ہوں۔

کل رات جب میں سنتری سے آنکھیں بچا کر ہاتھ میں ریو اور لئے سہا ہوا جا رہا تھا۔ یکایک میں نے اس کی بھاری آواز سنی۔ "ہاٹ ہاٹ" پھر اس گرج کر کہا۔ "کون ہے۔ کھڑے رہو۔" اس کے بعد اور کوئی آواز نہیں آئی۔ صرف خاموش ہوا کی سائیں سائیں سنائی دے رہی تھی میں نے یکایک مڑ کر دیکھا۔ ایک عربی دوستیزہ سُرخ لباس میں ملبوس سنتری کا ریو اور لئے بھاگی آ رہی ہے۔ اور سنتری بُت بنا دیکھ رہا ہے۔ میں نے اس کی طرف نشانہ کیا لیکن نشانہ خطا کر گیا۔ دوسری گولی چلانے والا ہی تھا کہ وہ میری طرف رُخ کر کے کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے سپاہی کی طرح اپنے ریو اور کا بولٹ بند کیا۔ پھر اسے پھینک کر زمین پر بیٹھ گئی۔ یہ دیکھ کر میرا جسم سہم گیا۔ اور کچھ دیر بعد جب ہوا کے جھونکے سے اس کا نقاب اٹا۔ تو میں نے دیکھا کہ یہ وہی بدوی حسینہ گل ہے۔ اس کی زنگی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے رواں دواں تھے۔ اور سارا جسم نہ جانے کس دُکھ کے زیر اثر تھر تھرا رہا تھا۔ وہ اپنے دل کی باتیں آنسوؤں کی زبانی اس طرح ادا کر رہی تھی۔ "ظالم اتنے دنوں

بعد تم دکھائی دئیے، اس کی اس تڑپ نے میری آنکھوں کے سنگریزوں کو اتنے دلوں کے بعد کاٹ ڈالا۔ اور آنسوؤں کے دو قطرے ڈھلک پڑے۔

پھر ایک مرتبہ میں نے دیکھا۔ خوبصورت آسمان کی جانب جہاں حسین تارے نور کی کشتیوں میں شہر میں راگ لاپتے ہوئے جا رہے تھے اور چاند ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ آج میں محبت کی قربان گاہ میں قربانی دوں گا۔ نہیں، نہیں، کبھی نہیں۔

میرا دل جلنے لگا۔ آنکھیں بیقرار ہو گئیں۔ میں نے بجلی کی سی عورت کے ساتھ ریو الور کو ہاتھ میں لیا اور یکایک نہ جانے کس شاخ سے کھڑکھڑ کرتے ہوئے یہ آواز آئی: ”گولی چلاؤ“

سن! سن! سن!!! پھر ایک دردناک چیخ آئی: ”ماں! ماں! ماں!!!“

میری زندگی کے پردے پر اندھیرا سا چھا گیا۔ اور دل کے ہر تار میں بیقراریاں ناچنے لگیں۔ پھر میں نے بڑی مشکلوں سے آنکھیں بند کر کے پکارا گل! گل! گل! سنا آہ! اس کی آنکھوں کے ٹکاتا آنسو برسات کی بوندوں کی طرح چاروں طرف گہر بن کر چھلائے۔ پھر اس

نے تڑپ کر مجھے اپنی کانپتی ہوئی مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ اور بالکل قریب آکر آہیں بھرنے لگی۔ بہت دیر بعد آہستہ آہستہ اس نے اپنی پلکیں کھولیں اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”آہ محبوب کے ہاتھوں محبوبہ کی موت کتنی حسین ہوتی ہے۔“ لیکن میں چٹان کی طرح جمیں بیٹھا رہا۔ وہ مسکرائی اور اس کی مسکراہٹ فضا میں مل گئی۔ وہ مجھے اپنے نرم و گداز ہاتھوں کی گرفت میں لئے ہوئے تھی۔ اور اس کی شبہی آنکھیں ننھے شوگنوں کی مانند شکفتہ ہو گئی تھیں۔ آخر وہ مجھ سے کیا چاہتی تھی۔ آہ! اس کی کھلی ہوئی پلکیں۔ کیا انسانی زندگی میں کامیابی کی یہی منزل ہے؟ اور ایک بار میں نے غم سے نڈھال ہو کر پکارا ”گل، گل!“ لیکن ہوا کے اندر ایک تلخ ہنسی پھوٹی اور یہ آواز آئی۔ ”بھول، بھول، بھول!“ ایک مرتبہ پھر سارے بادل منتشر ہو کر چاند کی روشنی کو اجاگر کرنے لگے۔ میں گل کے جسم کو اپنی گرفت میں لیکر چھینے لگا۔ اسی وقت ایک ادھیڑ بدی عورت نے آکر گل کو مجھ سے چھین لیا۔ اور وہ اچھچھج کر رونے لگی۔

”گل، مہیری رانی۔ گل!“

ادھیڑ عمر عورت گل کے جسم میں سر رکھے رو رہی تھی۔ میں بے چین ہو گیا اور عالم بیہوشی میں یہ آواز غل گئی۔ امی، امی! ماں کی طرح

وہ میرے گالوں میں بوسہ دیتے ہوئے بولی : ”بیٹا !“ اور اس کے
آنسوؤں کے کئی قطرے میرے سر پر آ گئے ۔

پھر ایک بار میں پکار اٹھا : ”امی ، امی ، امی !“ اور ایک گھٹی گھٹی سی
آواز فضا میں تیر گئی : ”بیٹا !“

دور بہت دور ۔ پہاڑی کے اس پار سے کسی پاگل ماں کی آوازیں
لڑتی ہوئی آرہی تھیں ”آہ ، آہ ، آہ !“ ساتھ ہی عربی گھوڑے کے ٹاپوں
کی صدائیں دوسری طرف ہنگامہ ریز تھیں : ”کھٹ ، کھٹ ، کھٹ :“

کراچی !

ابراؤد شام ! آج میں کنگال ہوں یا شہنشاہ ؟ قیدی
ہوں یا آزاد ؟ آسودہ ہوں یا خالی ؟ آج میں شام کی ادا اس گھڑیوں
میں تنہا بیٹھا سوچ رہا ہوں ۔ اور میرے سر کے اوپر لامحدود آسمان سے
گاہے گاہے بارش کے سنگیزے گرنے لگتے ہیں : ”رم جھم ، جھم !“
آہ میری زندگی کا یہ خلا ، کاش !

قاضی نذر الاسلام اور ان کے افسانے

بنگلہ کے انقلابی ادیب قاضی نذر الاسلام اپنی ولولہ انگیز شاعری اور مجاہدانہ خیالات کی وجہ سے اردو داں طبقے میں اچھی طرح معروف ہیں۔ یہ وہی بیباک شاعر ہیں جنہیں بنگال نے ”بدروہی کوی“ یعنی باغی شاعر کا خطاب دیا یہ اس لئے کہ ان کی معرکہ آرا نظم ”بدروہی“ بنگالی ادب کا ایک ایسا شہ پارہ تسلیم کی جاتی ہے جس نے نذر الاسلام کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ یہ نظم ”باغی“ کے عنوان سے ہماری زبان میں منتقل ہو چکی ہے۔ اور کون ہے جس نے اسے پڑھ کر اس کے مصنف کو خراج تحسین نہ دیا ہو گا۔ ہر خیز کہ قاضی موصوف کی شاعری اس مضمون کا موضوع نہیں ہے۔ پھر بھی ذیل میں اس نظم کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے کہ دراصل اس نظم ہی نے ان کی عظمت کا ڈنکا بجایا اور ہر

وطن پرست کے دل پر ان کی جدت طرازی، ترقی پسندی اور ان کے
ادبی کمال کا سکہ بٹھایا :-

کہہ دے اے نوجوان کہہ دے — کہ میں سر بلند ہوں
اتنا بلند کہ ہمالیہ کی چوٹی بھی میرے آگے سرنگوں ہے —
میں سرکش، سنگدل اور آتش زبان ہوں —
میں قیامت کا ندیم ہوں طوفان ہوں، تباہی ہوں، دہشت ہوں —
میں دنیا کے لئے سراپا ہلاکت ہوں —

کہہ دے، ہاں نوجوان کہہ دے کہ میں ہمیشہ سر بلند رہوں گا —
میں باغی ہوں، باد گیتی کی سرکش اولاد!
میری راہ میں جو چیز حائل ہوتی ہے اسے میں چور چور کڑواؤں
اپنی خودی کے علاوہ میں کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا —
میں صور اسرافیل کی صدائے بازگشت ہوں —
قیامت کے دیوتا کا پرچم اور جبریل کا عصا ہوں —

کہہ دے اے نوجوان کہہ دے ،
جب میں بگڑ کر اٹھتا ہوں تو آسمان کو ہلا دیتا ہوں اور دوزخ

بھی تھر تھر کانپنے لگتی ہے۔

میں شہابِ ثاقب ہوں، مرتجح ہوں، دُمدار ستارہ ہوں زہریلے
ناگ کا من ہوں۔

میں اسی دن مطمئن ہوں گا جب مظلوموں کی فریادِ فضائے
آسمانی میں نہ گونجے گی۔

جب میدانِ جنگ میں تلواروں اور خنجروں کے خوفناک ترانے
نہیں سُنانی دیں گے۔

اس اقتباس سے یہ بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قاضی موصوف
کے فکر میں جس قدر بلندی اور سرگرمی ہے ان کے اظہار میں بھی اتنا ہی
جوش اور آگ بھری ہوتی ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے
پتہ چلتا ہے کہ ایک ناپید اکنا رمند رہے جو امند آیا ہے اور کوئی دم میں
تمام قیود توڑ دے گا۔ ایک کوہِ آتش فشاں ہے جس کا لاوا اپنی راہ
میں حائل ہونے والی ہر شے کو ہلاک و برباد کر دے گا۔ ان کا کلام
خود مہمنہ سے بوتا ہوا معلوم ہوتا ہے، کہ میرا خالق نڈر ہے، باغی
ہے جبری ہے۔ اس کی آنکھوں میں شعلے لپکتے ہیں۔ اس کے دامن میں
بھٹیاں سلگتی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ہلکیں غلاموں

اور بھوکوں کی تکلیف سے بھیگی ہوئی ہیں۔ ان کے لبوں پر بکیوں اور
مجبوروں کے لئے دردناک نالے ہیں۔

— لیکن یہ سب کیوں؟ کیوں وہ غریبوں کیلئے بیقرار اور وطن
کی خاطر سرفروشی پر آمادہ ہیں؟ آئیے، ان کی زندگی کی ایک ہلکی سی
تصویر دیکھیں جس کے نقوش مدھم ہونے کے باوجود صاف بتاتے ہیں کہ
ان کی تخلیقات میں مظلوموں کیلئے بہمدردی اور ظالموں کیلئے دہشت
کیونکر جاگ رہی ہیں؟

قاضی نذر الاسلام ۱۸۹۷ء میں برطانوی کے ایک مفلوک الحال
مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ گھرانہ کسانوں کا تھا جو مالی مشکلات
اور مختلف صعوبتوں میں مبتلا تھا۔ چھوٹی سی عمر میں والدین کا سایہ سر
سے اٹھ گیا، اور ان کی پرورش کا بار ان کی چچی نے اپنے ذمہ لیا۔
جن کی خوبیوں کا ذکر موصوف نے اپنی کتاب "باندھن ہارا" میں بار
بار کیا ہے۔ فاقہ کشی کے باوجود انھوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔
اور مقامی زبانوں کے علاوہ فارسی اور انگریزی زبانیں بھی سیکھیں
بنگال چونکہ نعمات کی سرزمین ہے اس لئے سن شعور تک پہنچتے پہنچتے
انھیں موسیقی میں بھی مہارت حاصل ہو گئی۔ کوئی اٹھارہ سال کی عمر

سمی کہ جنگ عظیم چھڑ گئی۔ چونکہ فطرۃ عسکریہ پسند تھے اور عنفوان شباب
 ہی میں مایوسِ محبت بھی ہو چکے تھے اس لئے فوج میں بھرتی ہو کر بصرہ چلے
 گئے، جہاں اپنے جوش و خروش کی وجہ سے ترقی پا کر حوالدار کے عہدہ تک
 پہنچے۔ ایام جنگ میں ان کا قیام زیادہ تر بلادِ عربیہ میں رہا۔ اور وہ ان
 ممالک کی معاشرت و سیاست سے کافی متاثر ہوئے۔ اس زمانہ کی یہ
 بات قابلِ ذکر ہے کہ ان دنوں ان کی جوانی بہار پر تھی۔ رگوں میں عسکری
 خون اور دماغ میں گرم گرم نلاوے تیر رہے تھے۔ چنانچہ دن بھر سپاہیانہ
 سرگرمیاں دکھانے کے بعد جب وہ رات کی خاموشیوں میں کسی خندق یا
 پڑاؤ میں لیٹے ہوتے تو کوئی اندرونی خلش انھیں بے چین کرتی اور وہ
 مضطرب ہو کر کروٹیں بدلنے لگتے۔ آخر ایک دن ان بمقار یوں اور
 شب بیداریوں کا نتیجہ نکلا اور وہ یہ کہ ان کی قلبی کیفیات اشعار کے
 قالب میں ڈھل گئیں۔ گویا وہیں میدانِ کارزار میں ان کی شاعری
 نے جنم لیا۔ ظاہر ہے کہ جس ادبیت کی ابتدائیتوں کے سایہ میں ہوئی
 ہو وہ کس قدر پر جوش اور پُر زور ہو گی۔ اور چونکہ یہ شاعر ہر دم مغلسی
 اور مجبوری میں گھرا رہا اس لئے اس کے کلام میں بلا کی شدت اور
 اثر کا ہونا لازمی تھا۔ وہاں جنگی ماحول میں انھوں نے اپنے عزیزِ اقارب
 کو جو خط لکھے اگے چل کر وہ "باندھن ہارا" کے نام سے شائع ہوئے

ہیں۔ اور ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے وطن سے دور رہ کر
 اتنا کس طرح انھیں یاد کرتا ہے۔ کس طرح ان کا سوگ مناتا ہے
 اور پھر ان سے ہم آغوش ہونے کے لئے کس قدر بیقرار رہتا ہے۔
 ”باندھن ہارا“ کی بنا پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نذر الاسلام کی ادبیت
 کی ابتدا نشر سے ہوئی۔ کیونکہ یہ کتاب صرف خانگی مکاتیب ہی کا مجموعہ
 نہیں بلکہ ادبی اعتبار سے بھی پڑھنے کے لائق چیز ہے۔

میں نے ابھی کہا کہ نذر الاسلام کی شاعری لے و لعل جنم لیا جہاں
 گویا سنسناتی تھیں جہاں خون اور موت کے نظارے ہوتے تھے
 یعنی جہاں سار کا سار اگر دو پیش جنگی تھا۔ نیز وہ اس وقت ایسے
 عہد میں سے گزر رہے تھے جسے ان کی عمر کا انقلابی دور کہنا چاہئے۔
 کہ ایک طرف وہ فاقوں کے ستائے ہوئے تھے۔ مالی اور معاشرتی
 مشکلات نے انھیں گھیر رکھا تھا۔ وطن سے دور رہ کر اس کی غلامی کا
 احساس اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ اور دوسری طرف ان کے دل میں محبت
 کی ٹہنیں اٹھا کر تی تھیں۔ کوئی رہ رہ کر انھیں یاد آتا تھا۔ کسی کی وفات
 جفا کا خیال انھیں تڑپاتا رہتا تھا۔ بہر حال ان سب باتوں کا نمایاں
 طور پر اظہار شاعری کی صورت میں ہوا۔ اور جب وہ لام پر سے

واپس آئے تو ان کے ساتھ شاعری کا خاصا اچھا سرمایہ تھا۔ جس میں ہنھوں نے بعد میں بیش قیمت اضافہ کیا۔

نذر الاسلام کی شاعری دوسرے لوگوں سے بالکل جدا ہے فکر میں بھی اور بیان میں بھی۔ فکر کے لحاظ سے ان کا الگ مدرسہ خیال ہے کیونکہ وہ نئے انقلاب اور نئی تحریک کے علمبردار ہیں۔ طرز بیان میں وہ دوسرے شعراء سے اس لئے ممتاز ہیں کہ ان کے الفاظ، ان کی تراکیب اور ان کے کہنے کا ڈھنگ سکون پرور نہیں شرر بار ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس انداز سے کہتے ہیں کہ سننے والا چونک پڑتا ہے۔ ان کے الفاظ میں اس قدر صوفی حُسن بھرا ہوا ہے کہ ان کا مخاطب ان کی طرف متوجہ ہو کر دنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ سکون و جمود کو پسند نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اپنے کلام کے ذریعہ اہل وطن کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی قوم کو اپنے معاشرتی اور تہذیبی زوال کا احساس کرانے کے انقلاب کی دعوت دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جب تک یہ مفلسی کی تاریکیاں، یہ فاقے، یہ بھاریاں یہ زبان بندی، یہ قید و بند، یہ پستی بہ ذلت اور یہ انسانیت سوز حالات دور نہ ہو جائیں ہت و جبروت بن کر ڈرے ڈسے کو تباہ کر دو۔ تمام نظام پاش پاش کر دو۔ مختصر یہ کہ ان کی شاعری

خواب آور نہیں ہے۔ بلکہ طعنان ہے، طوفان ہے جو دوسروں کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔

نذر الاسلام اپنی سچائی، آزادی اور انصاف طلبی کی وجہ سے بنگال کے ہر طبقہ میں عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں میں وہ یکساں طور پر مقبول و پسندیدہ ہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کے کسی ادیب اور شاعر نے انسانی آزادی حاصل کرنے کے لئے بے شمار صعوبتوں اور مخالفتوں کے باوجود اس سچائی، اور دیانت داری کے ساتھ جدوجہد نہیں کی جتنی کہ نذر الاسلام نے۔ انھوں نے جو اپنے پڑھنے والوں میں ذہنی انقلاب برپا کر دیا، انھوں نے جو تجدید کے نعرے لگائے، انھوں نے جو حکومت پر تنقید کی اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ انھیں نہ صرف فوجی اعزاز اور پینشن سے محروم کر دیا جائے، نہ صرف ان کے کلام کے مجموعے ضبط کر لئے جائیں بلکہ انھیں بار بار زندان میں بند کر دیا جائے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی بد قسمتی بلکہ جرم یہ ہے کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ غلام آباد کے رہنے والے ہیں اور یہ بھی کہ مسلمان ہیں۔ جب ہی تو وہ اتنی زبردست اور عظیم الشان شخصیت کے مالک ہوتے ہوئے بھی مفلسی کے چٹکل میں گرفتار ہیں۔ فالج نے عرصہ سے

انہیں صاحبِ فراسٹ کر دیا ہے۔ اور کیا خبر وہ اب پلنگ سے کبھی نہ اٹھ سکیں۔ ان تمام اذیتوں کے باوجود ان کے خیالات میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ ان کا مطمح نظر اب بھی وہی ہے۔ انقلاب ! تعمیری تحریک !! اور آشتی کے لئے جنگ !!!

ان کے سوانح حیات سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ ایک سرفروشن مجاہد ہیں جو سر سے کفن باندھ کر نکلے ہیں۔ اور ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کبھی اور کسی اسٹیج پر پہنچ کر اپنے مسلک سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اپنے نصب العین کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ اور اذیتوں سے بچنے کے لئے غیر کامیاب سرٹو ہونڈ لیتے ہیں۔

نذر الاسلام نے شاعری کے ساتھ ساتھ دوسری اصنافِ ادب میں بھی ہمیشہ فہمیت اضاافہ کیا ہے۔ چنانچہ نظموں کے متعدد مجموعوں کے علاوہ انھوں نے نشر کی بھی کئی کتابیں یعنی ناول۔ ڈرامے۔ افسانے اور ادبی مضامین کے مجموعے ترتیب دیئے ہیں۔ ان تصانیف میں ”اگنی بنیا“ ”باندھن ہارا“ ”سرتو کھدا“ ”بتھار دان“ ”شربو ہارا“ اور ”شختیا“ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن

فی الحال میرے پیش نظر نذر الاسلام کے صرف افسانے ہیں۔
جنہیں جناب محمد یونس احمد نے اردو میں منتقل کیا ہے اور جو
اس مجموعہ میں ”طغیان“ کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے
ہیں۔

یہ افسانے پڑھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، اور خوشی بھی کہ نذر الاسلام
نے باغی حبیبی شرر بار نظمیں لکھنے کے علاوہ ہر نگار، حنا، اور مانجھی
ایسا گیت نہ گا جیسے دکن رومان بھی لکھے ہیں۔ لیکن طغیان کے
افسانے قاضی موصوف کی نظموں کی طرح دوسروں سے بالکل مختلف
ہیں۔ ان افسانوں کی چند اپنی خصوصیات ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان
میں ہمیں گزشتہ جنگ عظیم کی عینی تصویریں ملتی ہیں اور دوسرے
محبت کی کامرانیوں اور حسرت نصیبیوں کا بیان۔ یہ افسانے کیا ہیں
ایک قلم عشق ہے جس کی ایک ایک بوند میں بے پناہ عزائم اور
جذبات کروٹیں لے رہے ہیں۔ تیغ و سناں کی جھنکاروں کے
ساتھ ساتھ روح پرور گیتوں کے آبشار گرتے نظر آتے ہیں۔
ان افسانوں میں محض خیال و قیاس کا گزر نہیں بلکہ ان کا سالہ
اپنے گرد و پیش اور حقیقت و اصلیت سے بنایا گیا ہے۔ ان افسانوں
کے پس منظر میں آپ کو غریبوں کی سماجی اور معاشی بنیادیں نظر آئیں گی

جوشکستہ ہو چکی ہیں۔ وہ زندگیاں ملیں گی جو موت اور بھوک کے
 تانے بانے میں الجھی ہوئی ہیں۔ اور ان کے ساتھ عشق کی وہ
 دلفریب راگینیاں سنائی دیں گی جو حسن کی جھلک دیکھ کر فزوں سے
 فزوں تر ہو جاتی ہیں۔ یہ انسانے آج سے قریباً بیس سال پہلے
 لکھے گئے تھے۔ محو عشق و رقابت کے علاوہ جس معاشرتی اور عسکری
 زندگی کی ان میں عکاسی کی گئی ہے اس کے نفوس اس خوبصورتی
 سے اجاڑ کئے گئے ہیں جیسے وہ بالکل تازہ ہوں۔ یہ اس لئے کہ انسانی
 آزادی کیلئے تڑپ اور غلامی سے نفرت ابھی تک ہمارے دلوں میں
 قائم بلکہ تیز تر ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ان انسانوں میں ہمیں جنگ عظیم
 کی عینی تصویریں ملتی ہیں۔ کیونکہ مکھن والا خود میدان کارزار کا گرم
 سپاہی تھا۔ ذرا میدان جنگ کی ایک تصویر ملاحظہ فرمائیے۔ کتنی
 سچی، کتنی ہونناکب !۔

”اُف! آگ اور خون کی لاقتنا ہی بارش! کتنی بھیانک
 آواز! آسمان کی نیلی چھائی کا پتہ تک نہیں۔ ایسا معلوم
 ہوتا ہے کہ پورے آسمان میں آگ لگ گئی ہے۔ یوں
 کے پھٹنے سے آگ کی چنگاریوں کی جس طرح بارش ہو رہی
 ہے۔ اگر اسی طرح آسمان کی نیلی آنکھوں سے قطرے

گریں تو ساری دنیا غرقاب ہو جائے۔“
 جنگ کی یہ ہولناکیاں اور تباہ کاریاں — لیکن انسان
 انسان کے خون کا پیاسا، ایک دوسرے کا گلا کس سفاکی
 اور بے دردی سے دبا رہا ہے۔ ہائے ہو و او یلا کی لٹک
 چینی سپاہی کے پتھر جیسے دل گوگرد از نہیں کر سکتیں —
 رافل کی گولیاں جب انسان کے سینے میں چھید کرتی ہوئی
 نکل جاتی ہیں اس وقت موت و حیات کا سماں کتنا
 بھیانک ہوتا ہے۔“

(حنا)

ایک اور تصویر اتنی ہی خوفناک، اتنی ہی پُر صداقت —
 ”اب خدا کی مخلوق کو رافلوں اور شین گنوں کا شکار
 بنایا جائے گا۔ میرے کٹھور دل کی طرح یہ جنگ بھی انسانی
 زندگی کے لئے کٹھور ہے۔ چیخ و پکار، درد و کرب، آہیں
 اور سسکیاں کٹھور دلوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں
 رکھتیں۔“

نذر الاسلام ایک فلاکت زدہ خاندان میں پیدا ہوئے جہاں
 فتنہ کشی روز و شب کا وظیفہ تھا۔ یوں بھی بنگال کی

مفلسی اور قحط ضرب المثل ہو چکے ہیں۔ پیٹ کی خاطر ان کی کیا نہیں کرتا؟ حد ہے جان بوجھ کر موت سے ہم آغوش ہونے کیلئے فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے۔ اس مجموعہ کے آخری افسانے ”خلا“ کا آغاز دیکھئے اور دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے اس میں کس قدر کرب ہے، کس قدر درد و زفر یاد ہے:-

”آہ! اس وقت کی تصویر کشی میں کس طرح کروں، جب جوان امیدیں بھوک کی خاطر اپنے اپنے عزیزوں سے بچھڑ رہی تھیں۔ بنگال کا آسمان اور بنگال کی ہوا آنسوؤں کے سیلاب میں جیسے ڈوب گئی تھیں۔ نہ جانے ان بد بختوں میں سے پھر کون آگ اور خون سے بچ کر واپس آئیگا۔ کس کی بھوکی آنکھیں اور مرجھائے ہوئے دل بھر وطن کو لوٹ آئیں گے؟“

اس غلام آباد دلیس پر انھیں کتنا ترس آتا ہے۔ یہاں کے بزدل باشندوں پر وہ کس طرح جھنجھلا اٹھتے ہیں اس کی جھلک بھی ”خلا“ میں دیکھئے۔ ایک آنہادی کا خواباں، وطن کا شیردازی جنگ پر جانے کے لئے مچلتا ہے۔ مامتا کی ماری ماں اسے روکتی ہے تو وہ کہتا ہے:-

”ماں! آخر تم مجھے کیوں روک رہی ہو؟ کیوں تم آگ کی لپکتی ہوئی چنگاریوں کو محبت کی بھاری چٹانوں سے

و بادینا چاہتی ہو؟ اچھا ماں! میں تم سے ایک بات
 پوچھتا ہوں۔ بولو، تم ایک بی اے پاس رٹ کے کی ماں بننا
 چاہتی ہو یا بہادر رٹ کے کی؟ بولو، اس گونگے اور بزدل
 دیس میں کتنی مائیں ہیں جنہوں نے بہادر بچے جنم دیئے؟
 نذر الاسلام ظلم اور ظالم کا دشمن ہے لیکن وہ ان کو نیست و
 نابود کرنے کے لئے نرمی اور خوشامد کا قائل نہیں۔ تشدد کو میا میٹ
 کرنے کے واسطے عدم تشدد اختیار کر لینا اس کے نزدیک مہل ہے۔
 اس کی بجائے اس کا نظریہ یہ ہے کہ لوہے کو لوہے سے کاٹو۔ تعمیر کے لئے
 تخریب پر آمادہ ہو جاؤ۔ اور ان خیالات کا اظہار آپ کو ان انسانوں
 میں اکثر ملے گا۔ مثلاً،

”آج میں بہت کٹھور اور ظالم بن گیا ہوں۔ کیونکہ میں
 دکھ اور درد کی خلش سے تڑپ رہا ہوں مددہ دکھ جس نے
 مجھے باغی بننے پر مجبور کیا ہے اور موجودہ شہنشاہیت سے
 نبرد آزما کر کے پر ابھارا ہے۔ میں آج دریا کے بیل
 تھپیڑے کی مانند سخت چٹان کا کلیجہ چاک کرنے میں کامیاب
 ہو گیا ہوں“

(سلاخوں کے پیچھے)۔

اور یہی حکم رائے، یہی بلند وصلگی، یہی ایقان ایک اور جگہ طنز
 کے ساتھ لوں جلوہ گر ہوتا ہے،

”اے میرے مالک! میری ساری بلندیاں تیرے ہی
 ہی لئے ہیں۔ تو نے ہی میرے دونوں ہاتھوں کو خالی اور
 تنگ کر دیا ہے۔ تو نے ہی میرے سارے مہارے کو
 میرے گھربار کو ہوا کے شدید جھونکوں میں اڑا دیا ہے
 — میری تمنائیں راگھ کا ڈھیر بن گئیں۔ میری محبت کو
 نفرت سے بدل دیا گیا۔ . . . لیکن اب ایسا نہیں ہو
 سکتا۔ میں اپنے عزم میں اتنا ہی اٹل ہو گیا ہوں جیسے
 پہاڑ کی بلند و بالا چوٹیاں“

(شعلے اور بھول)

رزم و بزم کے مناظر کے بعد، اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیے
 جنگ کی ہولناکیوں اور عزائم کی ملکارت کے بعد ان دہرے و دکھن افسانوں
 کی بہار دیکھئے کہ وہ کس کس طرح محبت کی شدید و لذیذ کہانیاں سناتے
 ہیں۔ یہ آنکھوں افسانے زندگی کی پیڑ پھولوں اور رنگینوں کے دنوار
 مرقعے ہیں۔ ایسے رومان جن میں گھٹی گھٹی آہ و زاریاں اور زیر لب
 سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ جن میں چھل دو شیراؤں کی شوخیاں
 اور عشق کرنے والوں کی تمنائیں چلتی ہیں۔ ان رومانوں میں جذبات
 کی اتنی گہرائی اور شدت ہے کہ دوران مطالعہ میں کسی خارجی اثر کا
 احساس نہیں رہتا۔ دراصل یہ افسانے خود نذر آلا سلام کی آہستیاں

ہیں اور انہیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ محبت کی چوٹ کس قدر جاں گسل ہوتی ہے۔ اور دل کے زخم انسان کو کتنا بے چین و بے قرار رکھتے ہیں۔ ان افسانوں کی ابتدا عمر کے اس حصے سے ہوتی ہے جب مصنف تنہا کرتا ہے کہ :-

”کاش کوئی کنواری دوشیزہ ہوتی جو شام کے اندھیرے میں میری کٹیا کا چراغ روشن کرتی ۛ

(ما بچی ایسا گیت نہ گا)

اور پھر کلیجہ پر چوٹ کھا کر غم و حسرت سے کہتا ہے :-
 ”اس جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں جہاں میں سٹ رہا ہوں دل و دماغ میں شاعری کا آبشار پھوٹ رہا ہے اور میرے لبوں سے حسین نظمیں فضا میں بلند ہو رہی ہیں شاعری کی اس نئی تخلیق کو مہتاری محبت کا اعجاز کہوں یا کیا ؟ لیکن شاعری کے اس رس کو پا کر بھی میری زندگی پریشانیوں کا مرقع کیوں ہے ؟ کیوں نہیں آسمان زندگی میں جگنو جپکے اور ستارے مہتھے لگاتے جلیوں نہیں تخیلی محبت میں نقرئی مہتھے انکڑائیاں لیتے ۛ

(سلاخوں کے چھپے)

ان افسانوں میں بلا کی روانی اور برجستگی ہے۔ اس لئے کہ ان میں تصنع سے مطلق کام نہیں لیا گیا۔ جو جو کچھ دل پر ہو گذر اسے صداقت

اور صفائی کے ساتھ بیان کر دیا گیا۔ انھیں کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے دل کے داغ دکھانے میں عار نہیں۔ کہ ان کی محبت میں شدت کے ساتھ خلوص بھی ہے۔ وہ فطرۃ طوفانی ہیں۔ جیسے ان کے عزائم آتش فشاں کی مانند ہیں اسی طرح ان کے عشق میں طغیان ہے مگر وہ بے قابو ہو کر کہہ اٹھتے ہیں :-

”بتاؤ خدا را بتاؤ، ایس کیوں ہوتا ہے۔ دنیا میں ہزاروں ایسی مثالیں ہیں کہ جس عورت کو مرد نے اپنے کعبہ بدل کی ملکہ بنا نا چاہا اسی عورت نے اس مرد کے کلیجہ میں چھری بھونک دی۔ اس انجام کار کو پہنچ کر بھی وہ اس کے پاؤں کی مہندی بن کر تعاقب کرتا ہے۔“

اور جو تنگ نظر محبت جیسے ارفع و اعلیٰ جذبے کو برا سمجھتے ہیں انکو وہ میدان کارزار میں آبداد عادیاتا ہے :-

”آگ! تم یسو، برستی جاؤ۔ خدا کی قہارت و جبروت اپنے دامن میں سمیٹ لاؤ۔ اے صور اسرافیل تم اپنی ہستی کو آگاہ کرنے کے لئے اپنا کام شروع کو دو۔ بجادو اپنا صور۔ کیوں نہ پورا آسمان ان کے سروں پر گر جائے، جو محبت کو نظر بد سے دیکھتے ہیں۔ بے حیا انسان!“

(حنا)

میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ ظلم اور ظالم کو مٹانے کے لئے وہ خود ظلم کو

ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن کیا محبت کے معاملہ میں بھی ان کا یہی نظر یہ ہے؟ آخر کوئی محبت کا جواب محبت سے نہ دے تو کیا ظلم نہیں؟ کوئی کسی کے جذبات کو یوں ٹھکرا دے۔ رستہ ستمگزی نہیں؟ تو کیا وہ اس ظلم کا مداوا بھی ظلم سے چاہتی ہیں؟ نہیں یہاں وہ بے بس ہیں۔ جنگ کے معاملہ میں وہ چاہے ہر شے کو جائز سمجھتے ہوں۔ لیکن محبت کے معاملہ میں ان کا اصول مختلف ہے۔ یعنی :-

”ہم کے اندر جو ہے کی زنجیر پارہ پارہ کر دینے کی قوت ہے لیکن بھول کی پتی کا جگر پاش پاش کرنے کی تو اس میں ادنیٰ قوت بھی نہیں۔ جو ظالم ہے اس پر ظلم کرنا آسان ہے، لیکن جو خود ہی نازک ہے، نرم ہے، حسین ہے۔ اسے کون ضرب پہنچا سکتا ہے۔۔۔

اے میری محبوبہ! تم نے جتنے دکھ اور درد دیئے، میں نے ان کے مجموعے سے مقدس محبت کے مندر کی بنیاد رکھی ہے۔“

(آپ بیتیاں)

”طغیان“ کے افسانوں سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ نذر الاسلام نے کئی عورتوں سے الفت کی۔ شہر کی لڑکیوں سے لیکر دیہات کی ددشیزاؤں تک، اور ان کی یاد ان کے دل کو برماتی رہی۔ لیکن ان کی زندگی میں آوارگی نے کبھی قدم نہیں رکھا ہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں شفیقتی ہے، بواہوی مطلق نہیں۔ بلکہ پاکبازی کے وہ کس قدر

قائل ہیں یہ مندرجہ ذیل اقتباس سے عیاں ہے :-
 "آج میرا یہ احساس مجھے بے کل کر رہا ہے کہ میں نے
 اُن کنواری دوستیوں پر نگاہیں کیوں ڈالیں۔ اپنی
 کے عکس جھیل نے تو میرے ذہن و فکر کو روند ڈالا ہے۔
 لیکن یہ یاد کر کے مجھے سکون ہوتا ہے۔ کہ میں نے کسی کی
 بے عزتی نہیں کی۔ کسی کے معصوم دل کو اپنی محبت میں
 اسیر کر کے بے دردی سے نہیں ٹھکرایا۔ بلکہ میں نے ہی
 دست بستہ ان سے معافی مانگی۔ اور ہمیشہ ان کے
 مقدس حسن سے کتر اتار رہا۔ کسی دن بھی ان کی راہوں
 میں خلیج بن کر حائل نہیں ہوا۔"

(سلاخوں کے پچھے)

اسی ضمن میں محبت اور شادی کے مسئلے پر ان کے خیالات اچھی
 طرح واضح ہو جاتے ہیں :-

"جانتی ہوں میں سبھی کیوں نہیں ہو سکا۔ صرف اس لئے
 کہ میں عام انسانوں کی مانند مجازی محبت کے بندھن میں
 جکڑنا نہیں چاہتا۔ میری آنکھیں روزانہ دکھیتی ہیں کہ مرد
 عورت کے ساتھ بڑے خلوص سے پیش آنا ہے...
 عیش و عشرت کی ترنگیں بھٹکتی ہیں۔ لیکن وہ اس راز
 سے بے خبر ہے، کہ جس کے ساتھ اس نے اتنے دن رنگ

ریاں منائی ہیں اس کے دل کا حکم اس نہ بن سکا جسم تو
گوشت پوست کا لو قطر ہے۔ اس پر قابض ہونا کہاں
کی دانش مندی ہے؟ اس راز کو میں نے جس دن سے
سمجھ لیا ہے میں کسی کے ساتھ پیمانِ محبت باندھنے سے
ہمیشہ کنارہ کشی کرتا ہوں۔ مبادا کہ وہ میرے زانو
پر سر رکھ کر اور میری شریکِ حیات بن کر دوسرے کی
محبت میں بے گل ہوئے

عرضِ محبت کو وہ پاک اور مقدس سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک
اسے بے لوث ہونا چاہئے۔ عصمت اور پاک دامنِ ان پر فرض
ہے۔ بلکہ جب محبت میں گناہ کا خیال آجائے تو وہ محبتِ محبت نہیں
رہتی۔ ایک مکروہ اور لائقِ نفرت جذبہ بن جاتی ہے۔ نیکی اور حسن
صرف عشقِ پاکباز میں ہے۔ معصیت کسی طرح محمود نہیں۔ مہرنگار
میں انھوں نے کتنی پیاری بات کہی ہے:-

”مقدس چیز کی پوجا مقدس چیز ہی کر سکتی ہے۔
جس راہ میں گناہ چھپا ہو وہاں نیکی کو تلاش کرنا دانش
مندی نہیں۔ اگر سچاری گناہ کو لیا کر نیکی کی خواہش
کر لیا تو اس کا انجامِ ہلاکت ہے“

حسن اور عشق کے ساتھ ساتھ عورت کا ذکر لامبدي ہے اور ان
افسانوں کو پڑھ کر کہنا پڑتا ہے کہ نذرِ اسلام نے سنوائی نفیات کا

کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ وہ عورتوں کے جذبات سے خوب واقف ہیں۔ انھیں احساس ہے کہ جب محبت کی آندھی چلتی ہے تو عورت کے دل کا چراغ کس طرح بیم ورجا کی حالت میں بہرہ آتا رہتا ہے۔ چنانچہ ان افسانوں میں آپ کو ان لڑکیوں کا حال ملے گا جنہوں نے بے لوث محبت کی اور ان عورتوں کا بھی جن کے جذبات بے غرض نہیں تھے۔ اس کے علاوہ ان دو شیرازوں کی ذہنی کیفیات ملیں گی جنہیں اپنے ادیر یہ اعتماد تھا کہ کسی کو ان سے محبت کرنی چاہئے۔ یعنی وہ اس بات کی مستحق ہیں کہ کوئی انھیں چاہے، ان کے لئے نرٹپے۔ اور ان لڑکیوں کے احساسات بھی ملیں گے جنہیں خود اپنے اوپر ترس آتا ہے۔ جو خود کو اس لائق نہیں سمجھتیں کہ کوئی انھیں چاہے۔ عشق میں گرفتار اور محبوب کے فراق میں بقیقہ عورتوں کی آپ بیتیاں تو اپنے بہت سنی ہونگی۔ لیکن نذر الاسلام سے ایک نئی کہانی اس پیت کی ماری کی سنتے جو خود عشق میں مبتلا ہونے کے باوجود محبت کی طالب نہیں ہوتی :-

”دیکھو پردیسی! میں بالکل سیاہ ہوں۔ اسی لئے لوگ مجھے کج رویا کے نام سے پکارتے ہیں۔ میں اس زخم کو برداشت کر لیتی ہوں۔ اس نفرت انگیز نام کا نیش سہنے کی مجھ میں قوت ہے۔ مگر اسے اسخاں اور بھولے مسافر! تم یہ کہہ کر کیوں میری تذلیل کرتے ہو

کہ بہتیں مجھ سے محبت ہے۔ اے مرقعِ حسن! تم کیوں
اس بد نصیب اور ابھانگی کو حقارت آمیز نظروں سے
گھورتے ہو۔ میں اس تحقیر کی لاج کہاں چھپا رکھوں۔
میں جانتی ہوں کہ میں سیاہ ہوں۔ پھر تم مجھ سے محبت
جتا کر مجھے شرم و ندامت کی اندھیری دنیا میں کیوں پھینک
رہے ہو۔ جھی جھی —

(رم جمجم)
آگے چل کر اسی کشتہٴ محبت کا خدا سے شکوہ کئے۔ جس سے
شاید آسمان کی چھاتی بھی کانپ اٹھی ہوگی :-
”ایک دن وہ اشک بار آنکھوں میں لال لال چنگاریاں
پرورش کر کے راہِ خالق میں لیٹ کر بولی : آہ !۔ مجھے
ساری دنیا کیوں اس حقیر نام سے پکارتی ہے؟ خدا!
تو نے میرے وجود کی مٹی میں حسن کی ایک آدھ جھلک
کیوں نہ شامل کر دی۔ کیا اس طرح تیرا دیا حسن خالی
ہو جاتا۔ اگر تجھے میرے وجود کو اس طرح سیاہ کرنا تھا
تو پھر اس تاریک دل کے اندر روشنی کی مانند محبت کیوں
دی؟“

(رم جمجم)
قامنی نذر الاسلام کی شعری اور نثری دونوں تخلیقات عموماً

کھلی ہوئی چیزیں ہیں۔ وہ کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رکھتے۔ جو کہتے ہیں بے جھجک اور بر ملا۔ لیکن ان رومانوں میں انھوں نے اکثراً اشاروں اور کنایوں سے بھی کام لیا ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی انقلابی اوج یہاں بھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ وہ دل میں آئی ہوئی بات ضبط نہیں کر سکتے۔ اوپر کے اقتباس میں اگرچہ انھوں نے محرومیِ حسن کا شکوہ دبی زبان سے کیا ہے۔ لیکن ایک جگہ وہ کھلم کھلا کہہ اٹھتے ہیں :-

”میں نے سوچا، جس پھول میں خوشبو نہیں، جس کے اندر حسن و جمال نہیں اسے ہم بُری نظر سے کیوں دیکھیں
 اُسے ہم مجرم کیوں ٹھہرائیں۔ اگر اس کا کوئی مجرم ہے
 تو وہ عرشِ معلیٰ کا خالق ہے۔“

(مہرنگار)

اس مجموعہ میں آٹھ افسانے شامل ہیں۔ مابھی ایسا گیت نہ گا، رم جھم، سلاخوں کے پچھے، آپ بیتیاں، شعلے اور پھول، حنا، مہرنگار اور خلا۔ ان افسانوں کی مختلف جھلیاں آپ دیکھ چکے ہیں۔ لیکن ایک اور چیز جو خاص طور پر توجہ مبذول کرتی ہے یہ یہ ہے کہ ان کہانیوں کے پس منظر پر ہمیں تفکر کا دریا بہہ رہا ہے۔ مارتا ہونڈو نظر آتا ہے۔ یہ افسانے محض رومانی داستانیں نہیں بلکہ زندگی پر دلکش اور گہری تنقیدیں

ہیں۔ ان کے مصنف نے زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ زندگی کے رنگا رنگ شعبوں کا تجربہ کیا ہے۔ اپنے گرد و پیش کا مشاہدہ کیا ہے۔ اور پھر یہ دلسوز کہانیاں سنائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان انسانوں میں ہمیں بہت سے حکیمانہ اشارے ملتے ہیں۔ اور جیسے ایک عملی شعرِ بیاختہ وردِ زبان ہو جاتا ہے۔ یہ مبصرانہ کنائے آپ ہی آپ دل میں اتر جاتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے :-

”عورت کو دل دنیا جہنم کے پکے ہوئے شعلوں میں اپنی ہستی کو خاکِ ستر کر دینا ہے“

”محبوبہ کی دی ہوئی نشانیاں، محب کے لئے سکھ کا تحفہ ہیں“

”شاید اس نے یہ نہیں سمجھا کہ آفتابِ حقیقت باہر نہیں۔ جسم کے اندر جلوہ فگن رہتا ہے“

”عورت کا شباب کیا ہے؟ حقیقت اور مسرت کا منبع!“

”مرد ازل سے عورت کے دل کو فتح نہیں کر سکا۔ عورت کا باطنی راز سمجھنا بہت دشوار ہے۔ عورت سب کچھ دے سکتی ہے لیکن دل کا سرِ بستہ راز اور پوشیدہ نشانیاں آشکارا نہیں کر سکتیں“

”جس کے دل کے اندر دُکھ کی چٹائیں نہیں جلتیں

وہ دوسروں کے دکھ کو کیسے سمجھ سکتا ہے“
 ”اُف جوانی کی پہلی منزل میں محبت کا لمس کتنا پائیدار
 ہوتا ہے“

”ظاہری جنگ سے باطن کی جنگ زیادہ بھیانک اور
 ہولناک ہوتی ہے۔ جنگ کے فاتح بہترے ہو سکتے ہیں
 لیکن من کا فاتح کون ہو سکتا ہے“

”دوست کے سامنے زندگی کی غم کو داور روح فرسا
 کہانی سنا کر۔ اور کچھ اس کی زبان سے تشکین آمیز
 الفاظ سن کر ہی تو دل کا بار ہلکا ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو
 کیا کوشش کرنے کے بعد بھی دکھ کا دیکھنا ہوا آتش فشاں
 اور لپکتی ہوئی چنگاریاں سرد ہو سکتی ہیں؟“

قاضی نذر الاسلام پہلے شاعر اور پھر ادیب ہیں۔ اسی لئے انکی
 ہر تحریر میں رنگینی اور دلکشی ہے۔ وہ اپنی نثر میں بھی دلا دیزیتیں
 کہتے ہیں۔ اور اس کی نمایاں مثالیں ان رومانوں (طغیان) میں ہیں
 مثلاً۔

”یہ کہہ کر وہ اپنی دلنوازا گنی سے آبشاروں کے اندر
 شہابِ ثاقب پیدا کرنے لگے۔ اور ہر غنچہ دل نسیم
 بھجت سے شگفتہ ہونے لگا۔“

”جب میں نے سنا کہ امیر حبیب اللہ خاں شہید ہو گئے
تو مجھے احساس ہوا کہ اتنے دنوں بعد کوہ ہند و کش کی
چوٹی پُور چُور ہو گئی ہے۔ اور کوہ سلیمان کی اساس
اکھر گئی ہے۔“

”لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں مجھ جیسا خوش انسان
کوئی نہیں۔ شاید ان کے خیال کی وجہ یہ ہے کہ میں
ہمیشہ ہنستا رہتا ہوں۔ لیکن آہ ہندی کے سبز پتے کی
آغوش میں جتنے خون چھپے ہوئے ہیں ان کی خبر کسی
کو نہیں۔“

”یقین مانو! اس وقت میرے دُکھ کے مندر میں جیسے
سیاسی کی بے شمار زندگی جیج اٹھی تھی۔“

تو یہ ہے طغیان! اور اس کے افسانے، جن میں قاضی نذر الاسلام
نے خود اپنے عشق کی مصوم داستانیں سُنائی ہیں، یا اُن اٹھ
دوشیزاؤں کی دل سوز کہانیاں جنہوں نے اُن سے محبت کی۔
بہ حیثیت مجموعی ان رومانوں کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ نذر الاسلام
نے شاعری میں دماغی اور جسمانی آزادی کے لئے سرکشی کا علم بلند
کیا ہے۔ اور ان پسندیدہ قصوں میں دل کی بغاوت کا۔ اسی لئے
ان افسانوں میں دیکھے ہوئے انگاروں کی تپش کے علاوہ لہلہاتے

پچھلے پھولوں کی جہک بھی ہے۔ شعلوں کی لپک کے ساتھ گل و شبہم کی شیریں و لطافت بھی ہے۔

ان افسانوں کے مترجم مشہور ادیب جناب محمد یونس احمد ہیں، جو خود بنگال کے رہنے والے ہیں۔ اور کم و بیش اپنی مالی مشکلات و معاشرتی حالات میں سے گزر رہے ہیں چنانچہ اسلام کو پیش آئے۔ موصوف کا قاضی صاحب سے نہایت قریبی تعلق رہا ہے۔ اور انھوں نے "مشاعر انقلاب" کی بہت سی صحبتیں اٹھائی ہیں۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے ان ترجموں کے لئے جتنی دماغ سوزی کی ہوگی، اور جس خلوص سے ان افسانوں کو اردو میں منتقل کیا ہوگا کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ ترجمے اس قدر اچھے ہیں کہ ترجمے معلوم نہیں ہوتے۔ اور یہی اچھے ترجمہ کی نشانی ہے۔ یہی معنوی حیثیت تو بلا خوف و تردید کہا جاسکتا ہے کہ طغیان ہمارے افسانوی ادب میں نہایت عمدہ اور قیمتی اضافہ ہے۔

صادق الخیری

تصانیف صادق الخیری ایم۔ اے

(مضبوط جلد اور خوش منظر دپوش سے آراستہ)

شمع انجمن بقول دلفگار یہ اردو کے جراح ادیب اور سرکار ترجمہ جناب صادق الخیری کے سولہ میاک افسانوں کا مجموعہ ہے دوسرا ایڈیشن۔ قیمت چھ

دھنگ اس میں سات ولولہ انگیز رومان شریک ہیں۔ قوس قزح کی طرح رنگین اور پھولوں کی مانند شاداب۔ دھنگ میں اردو کا وہ معرکہ آور اہل روم

بیشیم، بھی شامل ہے جسے ادب لایہ اور انشا پر دازی کا شہ پارہ قرار دیا جاتا ہے دوسرا ایڈیشن پاکیزگی خیال اور رعنائی بیان ان افسانوں کی خصوصیت ہے نیک تمنا میں

بلیس اور معصوم جذبات شریف گھرانوں میں کس طرح پرورش پاتے ہیں۔ یہ آپ بلیس میں دیکھئے۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت چھ

سفینے ایشیا اور یورپ کے بہترین افسانوں کا ضخیم مجموعہ۔ بڑے سائز کی اس خوبصورت کتاب میں ملک ملک کے شیریں و لطیف قصے اور دیس دیس کی نئی و ترقی پسند

کہانیاں ہیں مشرق و مغرب کے بڑے بڑے مصنفوں کے یہ لاجواب افسانے صادق الخیری نے اس بے ساختگی سے ترجمہ کئے ہیں کہ بالکل طبع آزمایہ معلوم ہوتے ہیں۔ قیمت ہے

دوشیزہ صحرا عرب کے قی و وق صحرا میں محبت کا ایک خوشنما پھول کھلا، نہایت دلکش لیکن نہایت زہر والا۔ دوشیزہ صحرا اسی نگین کی حسین داستان ہے

جس کے لبوں پر الفت کی آہیں اور آنکھوں میں قتل و غارت کے اشک تھے دوسرا ایڈیشن قیمت چھ ناشر: رضا تون کتاب گھر، اردو بازار، دہلی

